C:\Users\Rashid\Desktop\3
copy.jpg not found.

■ اللہ کی باتیں، رسول اللہ کی باتیں
■ دینی مسائل
■ حضرت مولانا جمال صاحب.....
■ کتابوں کی دنیا (صد برگ)
■ مسلمانوں کا تعلیمی نظام.....
■ سپریم کورٹ کے حالیہ چند فیصلے
■ تنگ نظر ہندوتو سے کیرل میں کام نہیں چلے گا
■ اخبار جہاں، ہفتۂ رفتہ، طب وصحت

ہفتہ وار
نقیب
پھلواری شریف پٹنہ

مدیر
مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

معاون
مولانا رضوان احمد ندوی

جلد نمبر 55/65 شمارہ نمبر 40 مورخہ ۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۶/ اکتوبر ۲۰۱۷ء روز سوموار

ہاورم

ہمارے ملک ہندوستان میں مختلف مذاہب، تہذیب وثقافت کے لوگ رہتے ہیں، ہندو کے بعد مسلمان اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہے، انہوں نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق ادارے کھول رکھے ہیں، نہ تو سبھی مذہب کو ایک کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی مختلف مذاہب کے اداروں کو بند کرنا ممکن ہے، مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ اور بنارس ہندو یونیورسٹی دو ایسی یونیورسٹی ہے، جس کے نام کے ساتھ ہی ہندو، مسلمان لگا ہوا ہے، یہ یونیورسٹی کے کیرکٹر، کردار اور بانیوں کے خیالات کی عکاس ہے، اس نام سے ہی معلوم ہوتا ہے مسلم یونیورسٹی اقلیتی ادارہ ہے، جس کے اقلیتی کردار کی لڑائی زمانہ دراز سے چل رہی ہے، بنارس ہندو یونی ورسٹی کا ''ہ'' اور مسلم یونیورسٹی کا ''م'' مل کر ''ہم'' بنتے ہیں، جو اس ملک میں مختلف فرقوں کے مل جل کر رہنے کی عکاسی کرتے ہیں، ان دونوں یونیورسٹی کا تاریخی کردار ان ناموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یونی ورسٹی انسانوں کے ذریعہ ہی چلائی جاتی ہے، اس لیے اس میں بے ضابطگی ہوتی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یونی ورسٹی کے کام کاج پر نگاہ رکھنے اور رہنمائی کرنے کے لیے ملک میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) قائم ہے، اس نے دس مرکزی یونی ورسٹی سے موصول بے ضابطگیوں کی شکایت کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی، اس کمیٹی نے اپنے دائرہ کار سے باہر جا کر ایک ایسی تجویز پیش کر دی، جو لوگوں کے لیے انتہائی تشویش کا باعث تھا، تجویز میں کہا گیا تھا کہ دونوں یونیورسٹی کے نام سے ہندو مسلمان کا لفظ ہٹا دینا چاہیے، اس سے فرقہ واریت کی بو آتی ہے، انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس نے پہلی بار اس بات کو عوام کے سامنے رکھا، اور قبل اس کے کہ اس مسئلہ پر میڈیا میں گرما گرم بحث چلے، مرکزی وزیر تعلیم پرکاش جاوڈیکر اور مرکزی وزیر برائے اقلیت نے اپنی اپنی سطح سے اس تجویز کو رد کر دیا اور واضح کیا کہ حکومت کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے، اس لیے بات آئی گئی ہوگئی۔

اس تجویز کا اتنا نقصان تو ہو ہی گیا کہ آئندہ اس کمیٹی کے حوالہ سے اس بات کا تذکرہ کیا جاتا رہے گا اور کوئی سر پھری حکومت اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کمر بستہ بھی ہو سکتی ہے کیوں کہ طریقۂ کار یہی رہا ہے، پہلے ایک شوشہ چھوڑا جاتا ہے، پھر اس پر کچھ لوگوں سے بیان دلوایا جاتا ہے اور رائے عامہ جب بیدار ہو جاتی ہے یا تجویز پر ردعمل کا اندازہ ہو جاتا ہے تو بات آگے بڑھا دی جاتی ہے، اس لیے کمیٹی کے ارکان سے بھی یہ باز پرس ہونی چاہیے کہ انہوں نے اپنے دائرہ کار سے آگے بڑھ کر تجویز کیوں پیش کیا اور یہ کہ اس نام کا بے ضابطگیوں سے کیا تعلق ہے، اس کمیٹی کا فرض بنتا تھا کہ وہ یونیورسٹیوں میں تعلیمی معیار کی ترقی کی تجاویز پیش کرے، تدریسی اور غیر تدریسی عملہ کی قلت پر سوال اٹھائے، تعلیمی اداروں کو چھوڑ دینے والے بچوں کی شکایات اور دشواریوں کا جائزہ لے اور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہندوستان کس طرح ترقی کر سکتا ہے، اس کے لیے راہ عمل دکھائے، نہ کہ ہندو مسلم کو ہٹانے کی بات کرے، مشہور کانگریسی لیڈر سندیپ دکشت نے اس سفارش پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے بجا فرمایا کہ جو لوگ ہندو اور مسلم لفظوں کو فرقہ واریت سمجھتے ہیں وہ جان لیں کہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ بھارت میں مذکورہ دونوں الفاظ ہماری ملکی ثقافت کا حصہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے تعلیمی ادارے معیار کے اعتبار سے دنیا بھر میں کمزور سمجھتے جاتے ہیں، ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ ہندوستان کے دو تعلیمی ادارے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی دہلی نے دنیا کی ٹاپ دو سو یونیورسٹیوں میں اپنی جگہ بنائی ہے، ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ دوسرے ادارے بھی اس لائق ہوں کہ دنیا میں ان کی اپنی شناخت بن سکے اور ہم اپنے تعلیمی اداروں کے معیار پر اعتماد کر سکیں۔ اس غیر ضروری تجویز کو فوری طور پر رد کر کے وزیر تعلیم نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ حکومت ایسی سطحی تجویزوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتی، اسے ہر حال میں معیار چاہیے اور اس معاملہ میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں ہوگی، یہ ایک اچھی سوچ ہے، حکومت کے اس سوچ کی قدر ہونی چاہیے، ہمارے یہاں ایک بڑی پریشانی یہ بھی ہے کہ حکومت کی صحیح اور کارآمد سوچ کو دماغ سے فائل اور فائل سے زمین تک کا سفر کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے، اور کبھی کبھی سوچ صرف دماغ کا حصہ بن کر رہ جاتی ہے، اسے بدگمانی نہ سمجھا جائے تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے، اللہ کرے تجربہ بدل جائے اور مشاہدہ جھوٹا قرار پائے۔

پٹاخے

پوری دنیا اس وقت فضائی آلودگی کو لیکر پریشان ہے، شور ہنگامے، پٹاخے اور آتش بازی سے فضا اتنی آلودہ ہو چکی ہے کہ کئی کئی روز سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے، پھیپھڑے متاثر ہوتے ہیں، آنکھ اور کان کی قوت سماعت وبصارت پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے، دیوالی شب برات اور شادی کی تقریب میں پٹاخے، آتش بازی، پنڈیا جے، ڈی جے کا استعمال بڑھ جاتا ہے، لوگوں کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے اور بیمار لوگوں کو نئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شادی بیاہ میں تو یہ محدود وقت کے لیے ہوتا ہے، لیکن پوجا پاٹ دیوالی اور شب برات کے موقع سے رات بھر اور کبھی کبھی تو کئی کئی دن جاری رہتا ہے۔ دہلی سے یہ اچھی خبر آئی ہے کہ اس بار سپریم کورٹ نے دیوالی کے موقع سے پٹاخوں کی بکری پر دہلی ان سی آر کے علاقوں میں عارضی طور پر پابندی لگا دی ہے، اس پابندی کا اثر دہلی اور اس کے قرب جوار کی دیوالی پر پڑے گا، اس پابندی سے پٹاخے کے تاجروں کو بھی پریشانیوں کا سامنا ہے، کیوں کہ مارکیٹ میں پچاس لاکھ کلو پٹاخے دوکانوں پر پڑے ہوئے ہیں، جس کی مالیت کا اندازہ ایک ہزار کروڑ کا ہے۔

کچھ لوگ پٹاخوں پر پابندی کو مذہبی رسم ورواج میں مداخلت قرار دے رہے ہیں، یہ تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے، یقیناً یہ روایت قدیم ہے، لیکن رام جی کی آمد پر دیوالی کہانیوں کے مطابق خوشی منائی گئی تھی، چراغاں کیا گیا تھا، مٹھائیاں تقسیم ہوئی تھیں، پٹاخے نہیں پھوڑے گیے تھے، واقعہ یہ ہے کہ دیوالی، شب برات اور شادی بیاہ کے موقع پر پٹاخے پھوڑنے کو مذہبی حیثیت کسی مذہب میں حاصل نہیں ہے، مختلف مذاہب کی تعلیمات میں تحریفات اور تبدیلی کے باوجود یہ بات یقینی ہے کہ کوئی بھی مذہب ان کاموں کی اجازت نہیں دیتا، جس سے انسانی جان کو خطرات لاحق ہوں اور اسے نقصان کا سامنا کرنا پڑے، پٹاخے کسی موقع سے استعمال کیے جائیں فضائی آلودگی کا سبب بنتے ہیں، یہ آلودگی بارود کی بھی ہوتی ہے، دھنوئیں کی بھی، صوتی آلودگی بھی پیدا ہوتی ہے اور شعاعی بھی، اس لیے سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں، امید ہے کہ اس سے سماج کو سنبھلنے اور سدھرنے کا موقع ملے گا۔

اس فیصلے میں صرف فروخت پر پابندی لگائی گئی ہے، پٹاخے کے استعمال پر نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس پٹاخے پہلے سے ہوں یا وہ دہلی سے باہر سے خرید کر لایا ہو تو پٹاخہ استعمال کر سکتا ہے، اگر اس فیصلے کا مطلب لوگوں نے یہی سمجھ لیا تو فیصلے کا کوئی اثر دہلی کی دیوالی پر نہیں پڑے گا، اور سپریم کورٹ کا فیصلہ ایک طرح سے تماشہ بن کر رہ جائیگا۔

دہلی ہی نہیں پورے ہندوستان کے باشندوں کو اس فیصلے کے الفاظ پر نہیں اس کے مقصد پر دھیان چاہیے اور مقصد ہے کہ دہلی اور ان سی آر کو فضائی آلودگی سے بچانا ہے، یقین جانئے زندگی کے تحفظ سے بڑا مسئلہ اس وقت کچھ نہیں ہے، یہ زندگی سانسوں کی آمد ورفت پر ٹکی ہوئی قانون خداوندی یہی ہے، مسئلہ صرف سانس لینے کا نہیں ہے، زہریلی ہوا اگر سانس کے ذریعہ جسم میں داخل ہو تو یہ ہماری زندگی کو ختم کرنے کا سبب بن سکتی ہے، اس لیے سماج اور سرکار کو اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری سمجھنی چاہیے، سماج اور سرکار جب اپنی ذمہ داری نبھانے میں کمزور ہو جاتی ہے تو عدلیہ کو آگے آنا پڑتا ہے اس مسئلہ میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ دہلی دنیا کا سب سے آلودہ شہر ہے، ۲۰۱۶ء کی ایک تحقیق کے مطابق وہاں کی ہوا میں 2.5 مائیکران سے چھوٹے اور صحت کے لحاظ سے انتہائی نقصاندہ پارٹی کولیٹ میٹر کی مقدار عالمی پیمانے سے انتیس گنا زیادہ ہے، یہ ذرات صرف پھیپھڑے کو ہی نہیں جسم کے دیگر اعضاء رئیسہ کو بھی سخت نقصان پہونچاتے ہیں، جن کی تلافی نہیں ہو سکتی ہے، انسانوں کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔

لطیفہ یہ ہے کہ ابھی تک یہی طے نہیں ہو پایا ہے کہ سب سے زیادہ فضائی آلودگی کس چیز سے پیدا ہوتی ہے، بحث زیادہ کم کی نہیں بحث انسانی صحت کے نقصان دہ ہونے کی ہے، نقصان نقصان ہے کم ہو یا زیادہ، ہمیں نقصان دہ چیزوں سے بچنا چاہیے اور اپنے کو ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہیے، سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل کرنا چاہیے، حکومت بھی سختی کرے اور سماج بھی اپنی ذمہ داری سمجھے تو سب کا بھلا ہو جائے گا۔

بلا تبصرہ

''سرکاری اسکولوں کی حالت فائلوں میں بھلے مضبوط ہوئی ہو، لیکن حقیقت یہی ہے کہ درجوں میں طلبہ کی حاضری گری ہے اور تعلیمی معیار میں گراوٹ آئی ہے، چوں کہ ان اسکولوں میں سدھار کی شکلیں نہیں دکھ رہی ہیں اس لیے اس کا فائدہ پرائیوٹ اسکول اٹھا رہے ہیں، وہ بچوں سے ایڈمیشن اور سہولیات کے نام پر بھاری بھرکم فیس وصولتے ہیں، حالاں کہ حال میں تعلیم میں سدھار کے کے لیے کچھ قدم اٹھائے گیے ہیں، لیکن وہ تبھی کارآمد ہوں گے جب حقیقت میں زمین پر کام ہوگا۔''

(جے کے پنچ، ہندوستان ۱۱/ اکتوبر ۲۰۱۷)

بین السطور

کامیابی کا راز

''ہماری زندگی کا جو خاکہ ہے اس میں ہر چیز کے لیے محنت اور تلاش کی گنجائش موجود ہے، اگر کسی چیز کے لیے محنت کی گنجائش نہیں ہے تو اسلام کی، جب کہ اسلام کی بتائی راہ پر چلنے اور اس میں اپنی صلاحیتوں کے صرف کرنے میں ہماری کامیابی کا راز پوشیدہ ہے، اسلام کا راستہ ہی ہماری موجودہ زندگی کو حقیقی مسرتوں تک پہونچاتا ہے اور اخروی زندگی میں سعادتوں اور کامیابیوں کے دروازے کھول سکتا ہے۔''

امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانی

اللہ کی باتیں ----- رسول اللہ کی باتیں

مولانا رضوان احمد ندوی

والدین کی ذمہ داری:

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے اور آپ بھی اس پر قائم رہئے ﴾(سورہ طٰہٰ)

مطلب : اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت اولاد کی نعمت بھی ہے، اس کے وجود سے گھر گل گلزار اور بارونق رہتا ہے اور جب والدین بڑھاپے کی عمر کو پہونچ جاتے ہیں تو یہی اولاد والدین کے لیے ظاہری طور پر سہارا بھی بنتے ہیں؛ اس لیے جو لوگ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں، وہ اولاد کی پیدائش کے لیے بڑے جتن کرتے ہیں، طرح طرح کی تدبیریں اختیار کرتے ہیں کہ وہ کسی طرح سے صاحب اولاد بن جائیں، کہیں دعا، اوراد اور ظائف میں لگے رہتے ہیں اور کبھی منت ونذریں مانتے ہیں، ﴿رب هب لي من لدنک ذرية طيبة انک سميع الدعاء﴾ (میرے رب آپ اپنے پاس سے مجھے پاکباز اولاد عطا فرمایئے، بیشک آپ دعا سننے والے ہیں۔) اللہ نے دعا قبول فرمائی اور بچہ کی ولادت ہوئی، بے قرار دل کو سکون آگیا، اب ہر باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو دینی تعلیم وتربیت سے آراستہ کرے، اس کے دل میں ایمان ویقین کو پختہ بنانے کے لیے اسلامی تہذیب وتمدن سے عشق وشیفتگی پیدا کرے؛ تاکہ ہر لمحہ وہر آن مومن ومسلم ہونے کا استحضار رہے، حکمت وشفقت کے ساتھ اچھے اور برے کی تمیز پیدا کرنے کی کوشش کرے، اسلامی نام کا انتخاب کرے؛ کیوں کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ تم لوگوں کو قیامت کے دن تمہارے اور تمہارے والدین کے نام سے پکارا جائے گا؛ اس لیے اچھا نام رکھو اور اس کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آؤ، گندی صحبت اور برے ماحول سے بچاؤ اور ہر طرح سے سعادت مند بنانے کی کوشش کرو اور ایک ایسا جانشیں بنانے کی جدوجہد کرتے رہو، جو تمہارے لیے صدقہ جاریہ بن سکے، اگر والدین نے بچوں کی اچھی تربیت نہ کی تو یہی بچے بڑے ہوکر والدین کے حقوق کو ادا نہیں کریں گے۔ آج ہمارے معاشرہ میں بہت سے صاحب اولاد اپنی اولاد کی نافرمانی کی شکایت کرتے ہیں، لوگوں سے تذکرہ کرتے ہیں کہ ہمارا بیٹا بغاوت کرتا ہے، مگر کبھی ہم نے اس پہلو پر غور کیا کہ اولاد کا بگاڑ کہیں ہماری غلط تربیت کا نتیجہ تو نہیں ہے کہ ہم اس کی شرارتوں اور شوخیوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، اس کے اخلاق وکردار بگڑتے رہے اور ہم اس کی بے جا محبت میں داد تحسین کردیتے رہے اور اس کی ہر جائز وناجائز خواہشات کو پوری کرنے میں لگے رہے، نہ تو ہم نے نماز کے لیے کبھی تنبیہ کی اور نہ علم دین سے آراستہ کیا اور جب یہی بچے بڑے ہوکر بگڑنے لگے، سرکشی پر اتر آئے تو بسا اوقات نفرت کے جذبوں سے اس کو اپنی میراث سے محروم کردینے کا فیصلہ لے لیا، اخبارات میں اعلان چھپوادیا کہ میں اپنی فلاں فلاں اولاد کو میراث سے محروم کرتا ہوں، جبکہ عاق کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، اللہ نے اولاد کے حصہ کو مقرر کردیا ہے، اس کا مالی حق والدین کی متروکہ جائیداد میں متعین کردیا، الا یہ کہ والدین اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد کو فروخت کردیں، مگر اس کی نوبت ہی کیوں آئے، اگر ہم خود شریعت وسنت کے پابند ہوں، اپنی اصلاح آپ خود کرلیں تو پورا خاندان کج روی اور بے راہ روی سے نجات حاصل کرسکتا ہے، تو پھر آیئے ہم اپنی زندگی کو اسلامی ڈھانچے میں ڈالنے کی کوشش کریں، نماز باجماعت کا اہتمام کریں اور سن بلوغ کے پہونچنے سے پہلے ہی اولاد کو نماز کی تاکید کریں اور جب بالغ ہوجائیں تو نماز میں غفلت برتنے پر تنبیہ کریں، اگر ہم اس قرآنی اصول کو زندگی کا نمونہ بنالیں تو ہمارا گھر ایک مثالی گھر ہوگا، جس کی خوشبو سے محلّہ اور پڑوس کے لوگ بھی معطر ہوں گے اور پھر اس کے ذریعہ ایک خوشگوار ماحول بنے گا۔

معاشرتی برائی:

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جس قوم میں خیانت کا بازار گرم ہوگا، اس قوم میں اللہ تعالیٰ دشمن کا خوف اور دہشت پھیلادے گا، جس معاشرہ میں زنا کی وبا عام ہوگی، وہ فنا کے گھاٹ اتر کر رہے گا، جس سوسائٹی میں ناپ تول میں بددیانتی کا رواج عام ہوگا، وہ رزق کی برکت سے محروم ہوجائے گا، جہاں ناحق فیصلے ہوں گے، وہاں خونریزی لازما ہوکر رہے گی اور جس قوم نے بدعہدی کی، اس پر دشمن کا تسلط بہرحال ہوکر رہے گا۔ (مشکوٰۃ شریف)

وضاحت : دنیا میں قومیں اخلاق وکردار کی پاکیزگی اور اعلیٰ فکری صلاحیتوں کی بنیاد پر ترقی کرتی ہیں؛ لیکن اگر قوم وملت کی فکر ونظر میں بددیانتی کے جراثیم پیدا ہوجائیں تو انسانیت کی بنیادیں کھوکھلی ہوکر رہ جائیں گی، آج ہمارا معاشرہ مختلف طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہے، امانت میں خیانت کرنے کا ایک عام مزاج بنتا جارہا ہے، کہیں مال ودولت میں خیانت ہورہی ہے تو کہیں دفتروں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور وملازمین اپنی ڈیوٹی میں خیانت کرتے ہیں، جس سے ہماری صداقت ودیانت مشکوک ہوتی جارہی ہے اور آخر میں فتنہ وفساد کا ماحول بن جاتا ہے، اسی طرح زنا وناجائز جنسی تعلقات سے معاشرہ میں تکدر اور گھٹن کی مسموم فضا پیدا ہوتی ہے اور بقول حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے زنا کے زہریلے اثرات سے انسان کے اندر بھلے اور برے کی تمیز تک باقی نہیں رہتی؛ بلکہ اور خباثت مرغوب ہوجاتی ہے، حلال وحرام کی بحث نہیں رہتی ہے اور جو عورت اس کو پسند آتی ہے، اس کا اصلی مقصد اس سے زنا کرنا اور اس کو زنا کاری پر راضی کرنا ہوتا ہے، اسی لیے قرآن کریم اور حدیث شریف میں تمام جراثیم میں فحش ترین جرم زنا کو قرار دیا اور اس کی سزائیں بھی سخت مقرر کیں، مذکورہ حدیث میں کہا گیا کہ جس معاشرہ میں ناپ تول میں کمی وبیشی کا رواج ہوگا، ڈنڈی مارنے کی عادت ہوگی تو اللہ تعالیٰ رزق کی برکت اٹھالیں گے۔ (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

دینی مسائل

مفتی احتکام الحق قاسمی

میت کے گھر والوں کے لیے کھانا بھیجنا

کسی کے یہاں میت ہوجائے تو اس کے گھر کھانا بھیجنے سے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ ہمارے یہاں عام طور سے ایسے موقع پر بھی تقریب شادی والا کھانا کھلایا جاتا ہے، نیز اس کھانے میں میت کے گھر والوں اور دور سے آئے ہوئے مہمانوں کے علاوہ میت کے تقریبا سارے رشتہ دار اور خاندان کے سارے افراد مرد وخواتین اور بچے شریک ہوتے ہیں، حالانکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کا گھر اس محلّہ یا قریب کے محلّہ میں ہوتا ہے اور وہ اپنے گھر جاکر بھی کھانا کھاسکتے ہیں، ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کھانا بنوانے والے کو کافی پریشانی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس طرح کی بدنظمیوں سے بچنے کے لیے اہل خانہ اگر خود ہی کھانے کا نظم کرلیں تو درست ہے یا نہیں؟ مشہور یہ ہے کہ تین دنوں تک میت کے گھر چولھا نہیں جلے گا، یہ کہاں تک درست ہے؟

الجـــــــواب و باللّٰہ التـــــــوفيق

کسی کے گھر کوئی میت ہوجائے تو چونکہ یہ بڑا حادثہ ہوتا ہے، جس کا غم اہل خانہ کو یقینی طور پر ہوتا ہے، اسی غم وحزن اور میت کی تجہیز وتکفین میں مصروفیت کی وجہ سے انہیں کھانا پکانے کا موقع نہیں ملتا، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں اور رشتہ داروں کو میت کے گھر کھانا بھجوانے کی ہدایت دی ہے، اور خود ان کا بھی اخلاقی فریضہ ہے کہ اہل میت کے گھر کھانا بھیجیں، تاکہ وہ اور ان کی تعزیت کے لیے دور دراز سے آنے والے مہمان کھانا کھاسکیں۔

”عن عبد اللّٰه بن جعفر رضی اللّٰه عنه قال لما جاء نعي جعفر رضی اللّٰه عنه قال النبی صلی اللّٰه عليه وسلم اصنعوا لأهل جعفر طعاماًفإنه قد جاء هم ما يشغلهم“ (رواه الترمذی و قال حديث حسن : ۱/۱۹۵ باب ما جاء فی الطعام يصنع لأهل الميت)

اس حدیث کی بنا پر فقہاء کرام نے فرمایا کہ میت کے اہل خانہ کے لیے ایک شب وروز کھانا بھیجنا مستحب ہے۔

”و يستحب لجيران أهل الميت والاقرباء الا باعد تهئية طعام لهم يشبعهم يومهم و ليلهم لقوله صلی اللّٰه عليه وسلم: اصنعوا لآل جعفر طعاما فإنه قد جاء هم ما يشغلهم“ (شامی: ۳/۱۴۸ مطلب فی الثواب علی المصيبة)

۲:۔ چونکہ یہ موقع غم کا ہوتا ہے، اس لیے اس کی مناسبت سے ادنیٰ یا متوسط قسم کا کھانا جو عام دنوں میں کھایا جاتا ہے، بنایا جائے، اعلیٰ درجہ کا پرتکلف کھانا جو فرحت ومسرت کے موقع پر تیار کیا جاتا ہے، اس سے پرہیز کیا جائے۔

”و من البدع المكروهة ما يفعل الان من ذبح الذبائح عند خروج الميت من البيت أو عند القبر و اعداد الطعام لمن يجتمع للتغزية كما يفعل ذٰلک فی الافراح و محافل السرور.“ (الفقه علی المذاهب الاربعة: ۱/۴۳۴)

۳:۔ میت کے وہ رشتے دار جن کا رشتہ کچھ دور کا ہے اور ان کا گھر قریب میں ہے، انہیں چاہئے کہ اپنے اپنے گھر کھانا کھائیں، میت کے خاندان کے سارے افراد اور سارے رشتے داروں کے کھانے کا بوجھ کھانا بنانے والے پر ڈالنا اور ان کو خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک غلط رسم ہے، جس سے پرہیز ضروری ہے، میت کی تدفین کے بعد سارے لوگوں کو اپنے اپنے کاموں میں لگنا چاہئے، میت کے گھر پڑے رہنا بہتر اور مناسب نہیں ہے۔

”يكره الإجتماع عند صاحب البيت و يكره الجلوس فی بيته حتی ياتی إليه من يعزی بل إذا فرغ و رجع الناس من الدفن فليتفرقوا و يشغل الناس بأمورهم و صاحب البيت بأمره.“ (رد المحتار: ۳/۱۴۹، باب صلوٰة الجنائز)

۴:۔ اگر اہل خانہ خود کھانا بنانا چاہیں تو بنا سکتے ہیں، شرعاً جائز اور درست ہے، یہ کہنا کہ تین دنوں تک میت کے گھر چولھا نہیں جلایا جاسکتا، شرعاً صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس کا ثبوت کتاب وسنت سے نہیں ہے۔

”فان دعت الحاجة إلی ذٰلک جاء فإنه ربما جاء هم من يحضر منهم القری و الاماكن البعيدةو يبيت عندهم“ (المغنی لابن قدامه: ۲/۴۱۳)

تیسرے دن دعوت کا اہتمام اور خواتین کو رخصت کرتے وقت کپڑے کا التزام

کسی کے یہاں میت ہوجائے تو تیسرے دن اہل خانہ پرتکلف دعوت کرتے ہیں، جس میں قرآن خوانی کا اہتمام ہوتا ہے، برادری وغیر برادری سبھوں کو دعوت دی جاتی ہے، رشتہ کی کچھ خواتین اس دعوت تک رکی رہتی ہیں، انہیں رخصت کرتے وقت لازمی طور پر کپڑا دیا جاتا ہے، شرعاً اس طرح کا عمل کیسا ہے؟

الجـــــــواب و باللّٰہ التـــــــوفيق

کسی کی وفات پر تیسرے دن مروجہ قرآن خوانی وضیافت کا اہتمام جس میں برادری وغیر برادری کو دعوت دی جاتی ہے، اور ان کے لیے پرتکلف کھانا تیار کیا جاتا ہے، اسی طرح خواتین کو رخصت کرتے وقت کپڑے کا التزام یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جن کا ثبوت کتاب وسنت، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین سے نہیں ہے، یہ سب غلط رسم ورواج ہیں، جن سے احتراز لازم وضروری ہے، کیوں کہ عام طور سے یہ چیزیں میت کی متروکہ جائداد سے تقسیم میراث سے قبل انجام دی جاتی ہیں، جب کہ میت کے وارثین میں عموما نابالغ بھی ہوتے ہیں، اور نابالغ کا مال کھانا شرعاً حرام ہے، نیز اس میں مقصود یا تو فخر ومباہات اور ریا ونمود ہوتا ہے یا پھر سماج کے لعن طعن کا خوف، جس کی وجہ سے امیر، غریب سب کو یہ رسمیں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں، جس کے لے بعض دفعہ کافی قرض بھی لینا پڑجاتا ہے، اور ایسی بھی نوبت آتی ہے کہ میت کے اہل خانہ اگر غریب ہوں تو اپنے مرحوم کے جانے کا جتنا غم اور جتنی فکر انہیں نہیں ستاتی، اس سے کہیں زیادہ اس غلط رسم ورواج کی فکر ستاتی ہے کہ برادری کو کھلائیں کہاں سے اور خواتین کو کپڑے دیں کہاں سے، لہٰذا اس طرح کے رسم ورواج سے بچنا اور دوسروں کو بچانا نہایت ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

امارت شرعیہ بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ کا ترجمان

ہفتہ وار
نقیب
پھلواری شریف، پٹنہ

پھلواری شریف

مورخہ ۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۶/اکتوبر ۲۰۱۷ء روز سوموار

نئی حج پالیسی

وزارت اقلیتی امور کے ذریعہ تشکیل کردہ پانچ رکنی اعلیٰ سطحی کمیٹی کی رپورٹ حج ریویو پالیسی 22-2018 کے طور پر اقلیتی امور کی وزارت کو دستیاب ہوگئی ہے، اور وزیر اقلیتی امور مختار عباس نقوی نے ممبئی میں اسے جاری کردیا ہے، کمیٹی نے جو تجاویز پیش کی ہیں، ان میں سے کئی پر پرنٹ میڈیا میں زوردار بحث چل رہی ہے اور گرما گرم بیانات آرہے ہیں۔

اس پالیسی میں جو سب سے زیادہ غلط بات ہے، وہ ہے پینتالیس سال یا اس سے زیادہ عمر کی خواتین کو بغیر محرم سفر حج کی اجازت۔ شریعت نے ان عورتوں پر جن کے پاس سفر حج میں ساتھ جانے کے لئے محرم نہیں ہیں، ان پر حج فرض نہیں کیا ہے یعنی استطاعت میں جن چیزوں کو شامل کیا گیا ہے، ان میں عورتوں کے لیے محرم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ نئی پالیسی میں پینتالیس سال سے زائد عمر کی خواتین کو چار یا اس سے زائد خواتین کے گروپ میں شامل کرکے بغیر محرم حج کی اجازت دی جائے گی، حکومت چاہتی ہے کہ وزیر اعظم نے لال قلعہ کی فصیل سے مسلم عورتوں کے سلسلہ میں صنفی مساوات کی جو بات کہی تھی، اسے زمین پر اتارے، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا معاملہ تین طلاق کو کالعدم کرنا تھا، اور دوسرا بغیر محرم کے حج کی اجازت، مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ چند سر پھری عورتیں جن کا مذہب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا کر مودی حکومت کی واہ واہی کریں گی، لیکن بیشتر خواتین جو اسلامی احکام پر عمل کرنا شرعی تقاضہ جانتی سمجھتی ہیں، وہ یقیناً اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گی اس لیے کہ وہ عبادت کا سفر معصیت کے ساتھ کرنا گوارہ نہیں کریں گی، ایک طرف عدالت دفعہ ۲۵ میں مسلم پرسنل لا کو شامل مانتی ہے اور دوسری طرف حکومت دینی مسائل ومعاملات میں مداخلت کے لیے کمربستہ ہے، اس تجویز کو قابل قبول بنانے کے لئے ایک جملہ جوڑ دیا گیا ہے کہ ''ان کا مسلک اس کی اجازت دیتا ہو'' اس جملہ سے مسلمانوں کے مابین تفریق تیز ہوگئی اور مسلمان مسلکی بنیادوں پر اس مسئلہ میں بھی بٹ جائیں گے، حالاں کہ حج کے معاملہ میں ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں تھی، اس کا نقصان مسلم کمیونٹی کو اٹھانا پڑے گا، اور حکومت یہی چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو جس طرح بھی تقسیم کیا جاسکتا ہو کردیا جائے، تاکہ ان کی طاقت کمزور ہو اور اس کا فائدہ اسلام دشمن طاقتوں کو پہونچے۔

اس پالیسی کا ایک جز کہا جاتا ہے کہ قربانی کا پیسہ حج کمیٹی کے پاس جمع کرنے کا بھی ہے، اس کے پہلے یہ تجربہ کیا گیا تھا اور مختلف ملی تنظیموں نے اس پر احتجاج کیا تھا، اس کے نتیجہ میں یہ تجویز حکومت نے واپس لے لی تھی، یہ تجویز قابل قبول اس لیے بھی نہیں ہے کہ حج کی ایک قسم افراد والے پر قربانی ہے ہی نہیں، بعض حالتوں میں روزے کی بھی سہولت ہے، افراد والے کم ہوتے ہیں، لیکن ان سے قربانی کے روپے وصول کرنا ان پر ظلم ہوگا، حکومت کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے۔ حج کمیٹی کے ذریعہ قربانی کرنے کرانے کے اور بھی مفاسد ہیں۔

اس پالیسی میں سرکاری سب سی ڈی ختم کرنے کی بھی تجویز ہے، اس سے عازمین حج پر کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ حج کمیٹی جو عازمین سے غیر ضروری طور پر کئی مہینے پہلے روپے جمع کرالیتی ہے، اس روایت کو بھی ختم کرنا چاہیے، کیوں کہ باخبر ذرائع کا کہنا ہے حج کمیٹی اس روپے سے سود کماتی ہے اور وہی رقم سب سی ڈی کے طور پر دی جاتی رہی ہے، جب سب سی ڈی ختم ہوگی تو عازمین کو یہ سہولت ملنی چاہیے کہ وہ حج کے سفر سے کچھ قبل رقم جمع کرے تاکہ اس کے اوپر کئی ماہ پہلے سے سفر حج کا بوجھ نہ پڑے۔ سب سی ڈی ختم کرنے کے ساتھ انڈین ایرلائنس سے سفر کے لزوم کو بھی ختم کرنا چاہیے، اس سے کرایہ میں کمی ہوگی، اور کمپٹیشن مارکیٹ میں جو ایرلائنس کم کرایہ لے گا اس کے ساتھ حج کمیٹی معاہدہ کرلے گی، لیکن حکومت کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے، وہ چاہتی ہے کہ حج کے لئے استعمال کئے جانے والے جہاز کو کمرشیل بنایا جائے اور ایک طرف سے جو فلائٹ خالی آتی ہے، اس کے لیے استعمال کی صورت پیدا کی جائے، اگر ایسا کرنے سے کرایہ کم ہوتا ہے تو ہمیں اس تجویز کا خیر مقدم کرنا چاہیے، اس پالیسی میں پرائیوٹ ٹور والوں کے لیے کوٹہ تیس فی صد کردیا گیا ہے، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے، پرائیوٹ ٹور کمپنیاں حاجیوں کو لوٹنے کا کام کرتی ہیں، عام طور پر جن سہولیات کا وعدہ لیا جاتا ہے وہ صرف وعدہ ہی رہ جاتا ہے اور حجاج اس نام پر ٹھگے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سفر خرچ بھی وہ زیادہ لیتے ہیں۔

پانی جہاز سے سفر کی تجویز مناسب ہے، اس سے اوسط آمدنی والے لوگوں کے لئے بھی حج میں جانا ممکن ہوسکے گا، البتہ امبارکیشن پوائنٹ کم کرنے کی تجویز سے عازمین کی پریشانیاں بڑھیں گی، اس لیے سارے امبارکیشن پوائنٹ کو علی حالہ باقی رکھنا چاہیے، کیوں کہ پانی جہاز سے جانے والے لوگ بڑی بندرگاہ سے ہی سفر کرسکیں گے، جب کہ ہوائی جہاز سے سفر کرنے والے عازمین پر دوسرے امبارکیشن پوائنٹ تک کا سفر غیر ضروری اور جسمانی طور پر تھکا دینے کا سبب ہوگا۔

اس پالیسی میں ستر سال سے زائد عمر کے عازمین اور چار بار قرعہ اندازی میں نہ آنے والے عازمین کے ساتھ بغیر قرعہ اندازی کے حج کی اجازت دینے کو بھی کالعدم کرنے کو کہا گیا ہے، یعنی اس زمرہ کے عازمین کو ترجیح دینے والی روایت کو ختم کردینا چاہیے، یہ تجویز غیر مناسب اس وجہ سے معلوم ہوتی ہے کہ عمر کی اس منزل میں جہاں ہر قدم پر موت کی آہٹ سنائی دیتی ہے ان کے ساتھ رعایت کرنی چاہیے، کمزوروں اور ضعیفوں کی رعایت تو شریعت اسلامیہ کا بھی حصہ ہے، اور ہندوستانی سماج کا بھی اس لیے اس میں سختی نہیں برتنی چاہیے۔

خادم الحجاج کی چھ سو پچیس سیٹوں اور پانچ سو سرکاری کوٹوں میں بھی تخفیف کی بات کہی گئی ہے، خادم الحجاج اور سرکاری کوٹے کا عملی فائدہ عازمین حجاج کو نہیں مل پاتا ہے، کچھ لوگوں کو اس سے سرکاری خرچ پر حج کی سعادت مل جاتی ہے، اس میں بھی دوسرے سرکاری محکموں کی طرح انتخاب میں ''بہت کچھ'' کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سرکاری خادم الحجاج اور سرکاری کوٹے میں تخفیف کرکے حکومت اس رقم کو عازمین کی دیگر سہولتوں میں استعمال کرنا چاہتی ہے تو ہمیں اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ البتہ خادم الحجاج کی افادیت بڑھائی جاسکے اور اس کے لیے میکانزم بنایا جائے تو حاجیوں کے لیے یہ سلسلہ مفید ہوسکتا ہے۔

باتیں اور بھی ہیں، جن پر قلم چلایا جاسکتا ہے، فی الوقت اتنا ہی اس لیے کہ ابھی تو یہ تجویز وزارت کے سامنے پیش کی گئی ہے، وزارت خود مختار ہے وہ جس تجویز کو چاہے منظور کرے اور جس تجویز کو چاہے رد کردے، اس قسم کی کمیٹیوں کی تشکیل کے وقت ہماری تجویز یہ ہے کہ کسی نامور عالم کو بھی کمیٹی کا ممبر بنانا چاہیے تاکہ وہ شرعی ذمہ داریوں اور تقاضوں کے سلسلے میں اپنی رائے رکھ سکے، تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عصری علوم کے لوگ اور آئی اس افسران کی معلومات مذہب کے معاملہ میں سطحی ہوتی ہے، اور اس قسم کے دانشور حضرات ہمیشہ ٹھوکر کھاتے ہیں، حج پالیسی کے مسئلہ کو ہی لیجئے اس کمیٹی میں اگر کوئی عالم ہوتا تو کمیٹی کی تجاویز میں اس قسم کی غلطیاں راہ نہیں پاتیں۔

بیوی کی عصمت دری

۱۱/اکتوبر ۲۰۱۷ء کو سپریم کورٹ نے نابالغ بیوی کے ساتھ جسمانی تعلقات کو عصمت دری قرار دیا ہے، ہندوستانی قانون کے مطابق ۱۸/سال سے کم عمر کی لڑکی نابالغ ہے، اس لیے اگر کوئی شوہر ۱۸/سال سے کم عمر کی بیوی کے ساتھ اس کی رضامندی سے جماع کرتا ہے تو یہ تعلق جرم سمجھا جائے گا اس لیے کہ اس عمر میں اس کی رضامندی اور عدم رضامندی کا کوئی مطلب نہیں ہے، اور اگر لڑکی ایک سال کے اندر عدالت جاتی ہے تو شوہر کو اس جرم میں سزا ہوسکتی ہے، حالاں کہ تعزیرات ہند کی دفعہ (۲) ۳۷۵ میں نابالغ بیوی کے ساتھ تعلق کو شادی شدہ ہونے کی وجہ سے جرم کے دائرے میں نہیں رکھا گیا تھا، بلکہ اسے استثنا حاصل تھا، یہ فیصلہ ''انڈ پینڈنٹ تھاٹ'' نام کی تنظیم پر سپریم کورٹ نے سنایا، اس مقدمہ کی سماعت جسٹس مدن بی لوکر اور جسٹس دیپک گپتا کر رہے تھے، ایک اندازہ کے مطابق اس وقت ملک میں نابالغ بیویوں کی تعداد دو کروڑ ہے، نیشنل فیملی ہیلتھ سروے ۲۰۱۶ء کے مطابق ہمارے ملک میں ستائیس فی صد لڑکیوں کی شادی اٹھارہ برس سے کم عمر میں ہی ہو جاتی ہے، حالاں کہ حالت طفلی کی شادی کے لیے امتناعی قانون اٹھاسی سال پہلے انگریزوں کے دور حکومت میں بنا تھا، لیکن یہ قانون عملی طور پر ہندوستانی سماج کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہیں رہا۔ 2006 میں اسے مزید سخت بنایا گیا اور نافذ کیا گیا۔

ہندوستان میں آبروریزی اور بچوں کی شادی سے متعلق قوانین میں رضامندی کی عمر میں تضاد ہے، اور اس تضاد کا سہارا لے کر ہی رضامندی سے کم عمر لڑکیوں سے بغیر شادی تعلقات کو زنا بالجبر کی طرح جرم نہیں مانا گیا ہے، جب کہ اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکیوں سے بغیر شادی تعلقات کو زنا بالجبر کی طرح جرم نہیں مانا گیا ہے، اور اس پر عدالت گارجین کو گرفتار کرکے سزا دے سکتی ہے، البتہ لڑکا لڑکی شادی کے بندھن میں بندھ جانے کی وجہ سے جسمانی تعلقات قائم کرسکتے تھے اور وہ عصمت دری آبروریزی کے ذیل میں نہیں آتے تھے کیوں کہ انہوں نے یہ جسمانی تعلق سماجی بندھن میں بندھنے کے بعد قائم کیا ہے۔

قانون میں ترمیم کی آواز پہلے بھی اٹھتی رہی تھی، جسٹس جے اس سرما کمیٹی نے ۲۰۱۳ء میں اس قانون میں ترمیم کی سفارش کی تھی اور اس پر عدالت میں بحث بھی ہوئی تھی اور دہلی ہائی کورٹ نے حکومت کی اس بات کو مان لیا تھا کہ ہندوستان میں شادی ایک پاک رشتہ ہے، جسے عصمت دری اور آبروریزی کے الزام سے دور رکھنا چاہیے، سپریم کورٹ کے موجودہ فیصلہ کا مطلب ہے کہ وکلاء جج صاحبان کو یہ بات سمجھانے میں ناکام ہوگئے۔

موجودہ فیصلہ ۱۱/اکتوبر ۲۰۱۷ء سے نافذ ہوگا اور اس کے بعد کسی نے ۱۸/سال سے کم عمر کی بیوی سے جسمانی رشتہ بنایا تو ایک سال کے اندر بیوی کو حق ہوگا کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے یہ فیصلہ سب مذہب پر لاگو ہوگا، اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ سرکار چاہتی ہے کہ صدیوں سے چلی آرہی روایت کو برقرار رکھا جائے اور عدالت چاہتی ہے تو پارلیامنٹ اس مسئلہ پر تفصیلی غور کرنے کو تیار ہے۔

اس فیصلہ سے خاندان ٹوٹے گا، جس عورت نے بھی عدالت کا رخ کیا تو سزا کاٹنے کے بعد جو شوہر واپس آئے گا کیا وہ اپنی بیوی کو وہ محبت دے پائے گا جو زن وشو میں ہونے چاہیے، کیا نارمل زندگی گذر سکے گی، یہ ایک سوال ہے، جس سے اور بہت سارے سوال ہی نہیں مسائل بھی پیدا ہوں گے، اصل اور سچی بات یہ ہے کہ ہم بڑی تیزی سے مغرب کی نقالی کررہے ہیں، اور یہ بھول رہے ہیں کہ مغربی ممالک نے اس قسم کے قانون نافذ کرکے خاندانی شیرازہ منتشر کرلیا ہے، اور ان کی زندگی قابل رحم بن گئی ہے۔

اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر ہر اعتبار سے مفید اور میاں بیوی دونوں کی رعایت پر مبنی ہے، اسلام میں بلوغیت کا تصور سال سے جڑا ہوا نہیں ہے، بلکہ جسمانی تبدیلی اور علامات بلوغ جس عمر میں سامنے آئیں لڑکا لڑکی بالغ سمجھے جائیں گے، لڑکیوں میں عموماً یہ تبدیلی ۹/سال سے بارہ سال تک کی عمر میں ہوا کرتی ہے اور لڑکے میں آخری حد پندرہ سال ہے، اس لیے سرکاری قانون سے ایک لڑکی نابالغ قرار پائے گی جبکہ علامات بلوغ کے پائے جانے کی وجہ سے اسلام اسے بالغ سمجھے گا اور نکاح کے بعد جنسی تعلقات کی اجازت ہوگی، یہی فرق ہے الٰہی قانون اور انسانی قانون میں، انسان کا بنایا ہوا قانون علم کی کمی اور بسا اوقات مفادات کے تحفظ کے لیے غیر فطری ہوجاتا ہے، جب کہ الٰہی قانون فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے اور اس میں کسی بھی دور میں تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

یادوں کے چراغ

حضرت مولانا جمال احمد خستہ مکیاوی

: ایڈیٹر کے قلم سے

شمالی بہار کی عظیم شخصیت، صاحب کشف وکرامات، عالم باعمل، شاعر بے بدل، مناظر بے مثال، ماہر استاذ، سابق سرپرست جامعہ عربیہ اشرف العلوم کنہواں، موجودہ ضلع سیتامڑھی حضرت مولانا جمال احمد خستہ مکیاوی بن شیخ اسد علی بن شیخ لال محمد بن شیخ عظیم الدین بن شیخ عثمان بن شیخ عبدالرحیم عرف پھول شاہ کا وصال مرض اسہال میں ۲۲/ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء کی شب چھ بج کر بائیس منٹ پر ہوا، ۲۳/ذیقعدہ بروز شنبہ صبح دس بجے تجہیز وتکفین عمل میں آئی، جنازہ کی نماز مولانا محفوظ الرحمٰن صابری مظاہری نے پڑھائی، ڈیڑھ ہزار سے زائد لوگ آخری سفر میں ساتھ تھے، تدفین جمال پور مٹھیا ترائی نیپال میں ہوئی، مزار بدعات سے پاک لیکن مرجع خلائق ہے۔

مولانا جمال احمد خستہ کی ولادت ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں موجودہ ضلع مدھوبنی کی مشہور ومعروف بستی مکیا بشن پور میں ہوئی، آپ کے والد شیخ اسد علی غلبہ حال کی وجہ سے ملنگ شاہ کے نام سے مشہور تھے، جدامجد شیخ عبد الرحیم عرف پھولو شاہ کا شمار بھی اپنے وقت کے بزرگوں میں ہوتا تھا، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں مکیا میں ہی مشہور فارسی داں مولوی الٰہی بخش بندھولوی سے حاصل کرنے کے بعد کچھ دن آواپور میں بسلسلہ تعلیم مقیم رہ کر صوفی رمضان علیؒ مولانا اسماعیل آواپوریؒ اور حضرت مولانا عبدالعزیز بسنتی کے ساتھ مدرسہ امدادیہ میں داخل ہوئے، وہاں سے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد جانا ہوا، اور حصول تعلیم کا آخری پڑاؤ دارالعلوم دیوبند قرار پایا، ایک اندازہ کے مطابق م ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں دارالعلوم میں داخلہ ہوا اور ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۹ء کے بعد فراغت پائی، آپ کے نامور اساتذہ میں میاں جی الٰہی بخش مولانا عبدالوہاب بلاس پوری، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی وغیرہ کا نام آتا ہے، دوران طالب علمی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے، لیکن وطن واپسی کے بعد صحبت ملنے کے خیال سے باطنی تعلق حضرت حاجی نعمت علی عرف خاکی شاہ سے قائم کرلیا، ایک روایت کے مطابق دورہ حدیث شریف کے سال آپ کے والد کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو آپ وطن واپس آگیے اور فراغت مدرسہ امدادیہ سے حاصل کی، جن سے آپ کو اجازت بیعت وخلافت حاصل تھی، حضرت دل جان علی عرف چنگل شاہ آپ کے خسر محترم تھے، اور ان کی لطف وعنایات بھی مولانا مرحوم کو حاصل تھی، مولانا پوری زندگی بدعات سے متنفر اور ہمارے اسلاف کے طریقہ پر قائم رہے، آپ خاموش طبیعت، اخفاء حال کے قائل تھے، اسی حال میں پوری زندگی یاد الٰہی میں گذار دیا۔

تدریسی زندگی کا آغاز بیریا نیپال میں مکتب سے کیا، مدرسہ محمودیہ راج پور روتہٹ نیپال مدرسہ جونیروا، مشرقی چمپارن، مدرسہ امداد الغربا بلوا نیپال، مدرسہ کلامیہ جونیروا، مدرسہ انوار العلوم جوکھا وغیرہ میں بھی آپ کا تعلیمی تدریسی اور تربیتی فیض پہونچا۔ ۳۵-۱۹۳۳ء تقریباً تین سال مدرسہ اشرف العلوم میں بحیثیت صدر مدرس تدریسی فرائض انجام دیا۔ اس علاقہ کے دینی ماحول اور ضلالت وگمراہی سے تحفظ میں بڑا حصہ حضرت کی جد وجہد، دعاء نیم شبی اور آہ سحرگاہی کا ہے، آپ کا شمار مستجاب الدعوات لوگوں میں تھا، علاقہ میں جب بھی قحط پڑتا، بارش نہیں ہوتی اور صلوٰۃ استسقاء کا اہتمام کیا جاتا تو امامت آپ ہی کے حصہ میں آتی، نماز کے بعد اپنی ہی ایک نظم کے اشعار پڑھتے اور جب اس مصرعہ پر پہونچتے کہ ''آسماں سے بھیج دے ایک جھومتا ابر مبیں'' تو اس قدر بارش ہوتی کہ لوگ شرابور ہوجاتے۔

مولانا کی پوری زندگی اسلام کی ترویج واشاعت اور شرک وبدعات سے سماج کو پاک کرنے میں گذری، انہوں نے بہت سارے فرقۂ باطلہ منحرفہ سے مناظرے کیے، تقریری بھی اور تحریری بھی جس کے نتیجے میں حق غالب ہوا اور علاقہ میں سنت کا چرچا ہوا، اور لوگوں نے شرک وبدعات سے توبہ کیا، بتوں پر چڑھاوا چڑھانے کا جو بعض علاقوں میں مزاج بن گیا تھا اس سے لوگوں میں نفرت پیدا ہوئی۔

مولانا نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، پہلی شادی مزاجی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہوئی، دوسری شادی حضرت شیخ دلجان عرف چنگل شاہ کی بڑی صاحب زادی حلیمہ سے کیا، ان کی بطن سے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں تولد ہوئیں، جن میں سے دو لڑکے نہال احمد اور بلال احمد صغر سنی میں کوچ کر گیے، ایک لڑکی زاہدہ بھی سن شعور کو پہونچ کر داغ مفارقت دے گئیں، اس طرح کا آپ نسلی اور صلبی سلسلہ صاحب زادہ مولانا کمال احمد اور مولانا خصال احمد اور چار لڑکیاں راشدہ، عابدہ، سیدہ اور شہیدہ سے جاری رہا، دوسری زوجہ کے انتقال کے بعد بچوں کی نگرانی کی غرض سے تیسری شادی بیوہ حدیثہ خاتون سے کیا، جو مولانا کے وصال کے بعد تیرہ سال زندہ رہیں اور ۲۵/ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ کو آخرت کے لیے روانہ ہوئیں۔

حضرت مولانا نورالحسن صاحب سنگاچوریؒ کی وفات کے بعد مدرسہ اشرف العلوم کنہواں کے سرپرست مقرر ہوئے پوری زندگی سرپرست رہے، مخدوم بہار حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے ظاہری اور باطنی دونوں سرپرستی ان کے حوالہ کردی تھی، اور مولانا ہر اعتبار سے اس مدرسہ کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔

مولانا اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے، خستہ تخلص تھا، حضرت صوفی رمضان علی صاحب کی وفات پر طویل مرثیہ کہا، جو ایک ساتھی کے فراق میں دل سے نکلا ہوا سوز ہے، دو شعر نمونۂ کلام کے طور پر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

کیوں نہ ہو صحبت احباب کی مجلسیں ویراں
شمع محفل نہ رہی ، لطف شبستاں نہ رہا
یوں تو لاکھ ہیں جہاں میں مہ وانور خستہ
زندگی جس یہ تھی وہ نیر تاباں نہ رہا

کتابوں کی دنیا

تبصرہ کے لئے کتابوں کے دو نسخے آنے ضروری ہیں

صد برگ

: مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

سید مصباح الدین احمد، سید فصیح الدین احمد (م ۱۹۹۶) بن سید عظیم الدین مرحوم کے نور نظر، لخت جگر ہیں، آبائی وطن محلہ میاں باغ چھپرہ ہے، لیکن رہتے محلہ شاہ رئیس عرف باؤلی حاجی پور میں ہیں، ملازمت ۱۹۹۶ء سے عدالت میں کرتے ہیں، آوازہ اردو کا بلند کرتے ہیں، چنانچہ اردو کے بینر تلے منعقد پروگراموں میں ملاقات کبھی کبھی میری ہوجایا کرتی ہے، انہوں نے انجمن ترقی اردو ویشالی، کاروان ادب اور اردو کا نسل شاخ ویشالی کے زیر سایہ خازن، جوائنٹ سکریٹری اور جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جو خدمات انجام دی ہیں اور اردو کی لڑائی لڑی ہے، وہ وقیع بھی ہے اور وسیع بھی، داستان طویل ہے اور یہ تحریر مختصر، تفصیل معلوم کرنی ہو تو انوارالحسن وسطوی کی کتاب انجمن ترقی اردو ویشالی کی خدمات کا مطالعہ کیجئے؛ جسے الہدیٰ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ حاجی پور نے شائع کیا ہے۔

''صد برگ'' انہیں سید مصباح الدین احمد کے مضامین کا مجموعہ ہے، جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے، باب اول علم ریاضی اور مسلم ریاضی داں، باب دوم تذکرہ صوفیاء ومشائخ، باب سوم سون پور وحاجی پور: تاریخ کے آئینے میں، باب چہارم علمی وادبی مضامین اور باب پنجم یاد رفتگاں پر مشتمل ہے۔ باب اول میں سات، باب دوم میں چار، باب سوم میں تین، باب چہارم میں سات اور باب پنجم میں چار؛ یعنی کل پچیس مضامین ہیں، علم ریاضی سے اپنا تعلق کبھی نہیں رہا، اسکول میں بھی اس مضمون سے وحشت سی رہی، اس لیے فنی اعتبار سے اس پر کچھ لکھنا میرے لیے ممکن نہیں، مغرب والوں کی زبان میں کہنا ہو تو یہ میرا فیلڈ نہیں ہے، البتہ یعقوب کندی، ثابت بن فرہ، محمد بن جابر، ابوالوفا، ابن الہیثم اور عمر خیام دوسرے علوم وفنون سے بھی جڑے رہے ہیں، اور اسلامی دنیا کے ماہ ونجوم ہیں، اس لیے کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے نام وکام سے واقفیت پہلے بھی تھی، عمر خیام کی رباعیات اور فارسی شاعری نے تو مجھے زمانہ تک محبوس بلکہ مدہوش رکھا تھا، سید مصباح الدین احمد نے علم ریاضی کے حوالہ سے ان حضرات کی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، ان اساطین علم وادب کا ایک خاص فن کے حوالہ سے مطالعہ مفید ہے اور سید مصباح الدین احمد کی یہ کاوش انتہائی معلوماتی اور لائق ستائش ہے اور ان لوگوں کے منہہ پر طمانچہ بھی، جو اس علم میں مسلمانوں کی اولیت تسلیم کرنے میں ہچکچاتے رہتے ہیں۔

دوسرا باب صوفیاء ومشائخ کے تذکرہ پر مشتمل ہے، حضرت مخدوم سید حسن داشمندؒ، سید احمد پیر دمڑیاؒ، مخدوم شاہ ابو الخیرؒ اور تذکرۃ حضرت شیخ ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمستؒ کا شمار ان بزرگان دین میں ہوتا ہے، جنہوں نے حاجی پور اور اس کے قریبی ضلع سارن میں معرفت خداوندی کے چراغ روشن کیے اور علم وادب کی بساط بچھائی، بہار تھرو دی ایجز میں آر آر دیوا کرنے عہد وسطیٰ میں جن علمی مراکز کا تذکرہ کیا ہے، ان میں ایک میر ملک فتح اللہ کا ادارہ عشری (موجودہ ضلع سیوان) اور دوسرا حاجی پور سید احمد پیر دمڑیا کی خانقاہ اور مدرسہ تھا، اس نقطۂ نظر سے ان حضرات کا تذکرہ قدیم علمی وعرفانی تاریخ کی بازیافت ہے، جس سے ہماری نئی نسل غافل ہوتی جارہی ہے، حالاں کہ ان حضرات کی زندگی میں ہمارے لیے بڑا سرمایہ ہے اور بزرگانِ دین کی زندگی کے نقوش ہمارے لیے نقش حیات ہیں، جن کے سہارے زندگی کو دنیاوی واخروی اعتبار سے مفید سے مفید تر بنایا جاسکتا ہے۔

تیسرے باب میں حاجی پور اور سون پور کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے، سون پور سے سید مصباح الدین احمد کا آبائی رشتہ ہے اور حاجی پور سے وطن ثانی کا، وطن اول ہو یا ثانی انسان کو محبوب ہوتا ہے، اس لیے سید مصباح الدین احمد نے حاجی پور کی تاریخی وتہذیبی پس منظر پر تحقیقی گفتگو کی ہے، سون پور کا میلہ ایک زمانہ میں ایشیا میں معروف تھا، اور اس کا ریلوے پلیٹ فارم اپنی لمبائی میں ہندوستان میں اکلوتا اور ممتاز سمجھا جاتا تھا، سون پور میلہ اب بھی لگتا ہے، لیکن رونق پہلے جیسی نہیں رہی، اسی طرح سون پور کا ریلوے پلیٹ فارم بھی لمبائی کی وجہ سے اب نہیں جانا پہچانا جاتا ہے، سون پور کے ایک گمنام شہیدِ وطن مولوی تجمل حسن کا تذکرہ بھی اس باب میں خاصے کی چیز ہے، اور بہار کے مسلم مجاہدین آزادی میں اضافہ کے قبیل سے ہے۔

باب چہارم کے علمی وادبی مضامین میں جگن ناتھ آزد کی خاکہ نگاری، پروفیسر قیام الدین احمد کے تحقیقی کارنامے، ڈاکٹر ثوبان فاروقی کی غزل گوئی، ذکی احمد اور ان کی تصنیف ''اپنا مرثیہ، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔ شخصیت اور جہتیں، فن مراسلہ نگاری اور انوارالحسن وسطوی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی: ایک مؤرخ، ایک محقق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، خاکہ نگاری، غزل گوئی، مرثیہ نگاری اور مراسلہ نگاری کا تعلق اصناف ادب سے ہے اور پروفیسر قیام الدین اور ثناء الہدیٰ قاسمی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تعلق تاریخ وتحقیق سے، پروفیسر قیام الدین تاریخ کا بڑا نام ہے، اور ان کا بڑا کام ہے، ثناء الہدیٰ قاسمی کی تاریخی اور تحقیقی جہتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ مضمون اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس حیثیت سے ثناء الہدیٰ قاسمی پر کم لکھا گیا ہے، بعد کے لوگوں کے لیے یہ ریفرنس کا کام کرسکتا ہے۔

باب پنجم میں یاد رفتگاں کے تحت محمد یوسف انجینئر، عبدالمغنی صدیقی ایڈوکیٹ، جسٹس شاہ نیر حسن، سید عبد الرافع کو یاد کیا گیا ہے، ان میں دو شخصیتیں حاجی پور کی ہیں اور دو پٹنہ کی، خدمات کے اعتبار سے دیکھیں تو شخصیات کے انتخاب میں تنوع ہے، انجینئر، ایڈوکیٹ، جسٹس اور صحافی سبھی موجود ہیں، صرف بے چارہ مولوی اس باب میں جگہ نہیں پاسکا ہے، اس باب میں مولانا نظام الدین صاحب خلش کو شامل کرلیا جاتا تو یہ کمی نہیں کھٹکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ حاجی پور کی مذہبی تاریخ مولانا نظام الدین خلش کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ بقیہ صفحہ ۱۱/ پر

مسلمانوں کا تعلیمی نظام: ایک تاریخی جائزہ

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

موجودہ دور میں مسلمانوں کے درمیان تعلیم کے دو دھارے (Stream) جاری ہیں، ایک کو قدیم یا دینی کہا جاتا ہے اور دوسرے کو جدید یا عصری۔ یہ دونوں دھارے متوازی چلتے ہیں اور جس طرح دریا کے دونوں کنارے طویل ترین فاصلہ طے کرنے کے باوجود کہیں نہیں ملتے، اسی طرح ان دونوں دھاروں کے درمیان بھی کہیں یکجائی نہیں ہوتی۔ والدین کو ابتدا ہی میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو کسی دینی مکتب یا مدرسے کے حوالے کریں یا کسی اسکول میں اس کا داخلہ کرائیں، جدید تعلیم حاصل کرنے والا بچہ ڈاکٹر، انجینیر، یا کسی پروفیشن کا ماہر تو بن جاتا ہے، لیکن اس کی دینی تعلیم واجبی سے بھی کم ہو پاتی ہے۔ دوسری طرف مدرسے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا عالم و فاضل ہو کر مسجد کی امامت اور مدرسے کی مسند صدارت سنبھالنے کے قابل تو ہو جاتا ہے، لیکن عموماً تیز رفتار ترقیات سے معمور دنیا میں وہ خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے، چنانچہ احساس کم تری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال میں کئی سوالات ابھرتے ہیں۔ کیا تعلیم کی یہ تقسیم دینی اعتبار سے درست ہے؟ کیا ایک صالح، کارآمد اور انسانیت کے لیے مفید معاشرہ کی تعمیر کے لیے اس تقسیم کو نہ صرف گوارا بلکہ باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اور سب سے بڑا سوال یہ کہ کیا مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں اس تقسیم کو روا رکھا تھا اور کیا انھوں نے مسلم بچوں اور بچیوں کے لیے دینی تعلیم کا الگ انتظام کیا تھا؟ اسلام علم کو 'دینی' اور 'دنیاوی' خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں ہے۔ بنیادی دینی تعلیم، جس کے ذریعہ انسان دین کے تقاضوں پر عمل کر سکے، اسے اس نے ہر مسلمان کے لیے لازم قرار دیا ہے۔ (طلب العلم فريضة على كل مسلم. (ابن ماجہ) اس کے بعد علم و معرفت کے تمام دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی طلب، مواقع اور محنت کے مطابق ان سے فیض حاصل کر سکتا ہے۔ آج جن علوم کو خالص دینی علوم کہا جاتا ہے، اگر کوئی شخص انھیں اس لیے حاصل کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ دنیا کمائے، سماج میں اونچی پوزیشن حاصل کرے اور لوگ اس کے علم و فضل کے قصیدے پڑھیں تو اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے شخص کو وعید سنائی ہے اور فرمایا ہے کہ وہ جنت سے اتنا دور ہوگا کہ اسے اس کی خوشبو بھی نہ آسکے گی، حالاں کہ اس کی خوشبو میلوں دور سے محسوس ہوگی۔ (من تعلّم علماً ممّا يبتغى به وجه الله لا يتعلّمه الا ليصيب به عرضاً من الدنيا، لم يجد عرف الجنة۔ (ابوداؤد) اس کے برعکس آج جن علوم کو خالص دنیاوی علوم سمجھا جاتا ہے، اگر کوئی شخص انھیں اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اس پر معرفتِ خداوندی کے اسرار کھلیں اور وہ ان کے ذریعہ خلق خدا کو فائدہ پہنچائے تو وہ اس پر ضرور بارگاہ الٰہی میں اجر و انعام کا مستحق ہوگا اور اس کا ٹھکانہ جنت میں ہوگا۔ قرآن کریم کی ایک آیت ہے: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاء (فاطر:28) ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں''۔ اس آیت میں 'خشیت الٰہی' سے بہرہ ور ہونے کا سہرا 'علماء' کے سر باندھا گیا ہے۔ لیکن کون سے 'علماء'؟ محض روایتی، قدیم، دینی علوم کے فیض یافتگان نہیں، بلکہ تمام علوم سے شغف رکھنے والے لوگ۔ اس آیت سے متصل اس کا نصف اول ٹکڑا اور اس سے پہلے کی آیت ملاحظہ کیجیے: أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفاً أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ. وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ (فاطر:۲۷-۸۲) ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں، جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں، جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں''۔ دیکھا جائے تو ان آیات میں علم موسمیات (Climatology) علم نباتات (Botany) علم طبقات الارض (Geology) علم بشریات (Anthropology) اور علم حیوانات (Zoology) کی طرف اشارے موجود ہیں اور ان تمام کا شمار موجودہ اصطلاحات کے اعتبار سے جدید علوم میں ہوتا ہے۔ تعلیم گاہ کی خشت اول مسجد نبوی میں بنے ہوئے چبوترے پر رکھی گئی تھی، جسے ہم 'صفہ' کے نام سے جانتے ہیں۔ وہاں بھی علم کی جامعیت کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اصحاب صفہ نہ صرف قرآن حفظ کرتے اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو سن کر اپنے سینوں میں محفوظ کرتے تھے، بلکہ لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے تھے اور فنونِ حرب کی بھی مشق کرتے تھے۔ غزوہ بدر کے موقع پر جن سردارانِ مکہ کو گرفتار کیا گیا تھا ان کا فدیہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ ہر شخص دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ ظاہر ہے کہ ان اسیرانِ قریش نے دینی تعلیم نہ دی ہوگی۔ عہد اموی میں جب اسلامی مملکت کی سرحدیں وسیع ہوئیں اور دیگر قوموں سے ربط و تعامل بڑھا تو اس زمانے کے مروّجہ علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ یزید بن ابی سفیان کی وفات (م ۶۴ھ) کے بعد رواج دیے گئے دستور کے مطابق ان کے بیٹے خالد کو زمامِ اقتدار سنبھالنی تھی، لیکن اس کا علمی شغف اتنا زیادہ تھا کہ اس نے خلافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خالد بن یزید نے خود بھی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا اور دوسروں سے بھی کروایا۔ عالم اسلام میں سیاسی آویزشیں جاری رہیں اور میدان سیاست میں کشت و خوں کا بازار گرم رہا، یہاں تک کہ خلافتِ بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور خلافتِ بنو عباس قائم ہو گئی، لیکن علمی تحریک برابر زور پکڑتی گئی۔ عباسی حکم رانوں: منصور اور ہارون رشید نے اس کی سرپرستی کی، یہاں تک کہ مامون رشید نے اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ اس کے عہد میں قائم 'بیت الحکمۃ' میں اس دور کے تمام مروّجہ علوم کی کتابوں کا دیگر زبانوں سے عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس دور میں خلافتِ اسلامی کے حدود میں مدارس کا قیام شروع ہوا تو ان میں علوم کی تقسیم کو روا نہ رکھا گیا۔ ان میں داخلہ لینے والے طلبہ تمام علوم حاصل کرتے تھے اور بعد میں ذوق کے مطابق کسی فن میں اختصاص کرتے تھے۔ تاریخ اسلامی میں دولت سلجوقیہ کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی (م ۵۸۴ھ) کے ذریعہ قائم ہونے والے مدرسے کو، جو اس کے نام سے منسوب ہو کر 'مدرسہ نظامیہ' کہلایا، غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) اور ان کے استاد امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) اسی طرح ابن الخطیب (م ۶۷۷ھ)، تبریزی شارح حماسہ (م ۵۰۲ھ)، ابوالحسن قفجقی شاگرد امام عبدالقادر جیلانی اور سعدی شیرازی نے اس مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی یا تدریس کے فرائض انجام دیے تھے۔ نظام الملک نے اپنے حدود مملکت کے دوسرے حصوں میں بھی مدارس کا جال بچھا دیا تھا۔ علامہ شبلیؒ نے اپنے مشہور مقالہ 'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم' میں ایسے مدارس کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے جو مسلم حکم رانوں کے دور میں ان کی حدودِ مملکت میں قائم ہوئے۔ نیسا پور، بغداد، ہرات، موصل، اصفہان، ماوراء النہر، بلخ، مرو اور خوارزم وغیرہ میں بڑے بڑے مدارس قائم تھے۔ علامہ شبلی نے انھیں موجودہ دور کی یونی ورسٹیوں سے تشبیہ دی ہے۔ انھوں نے مصر میں نور الدین زنگی (م ۵۶۹ھ) اور سلطان صلاح الدین ایوبی (م ۵۸۹ھ) کے زمانوں میں قائم ہونے والے مدارس کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ ایران، ترکی اور اندلس کے مدارس کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا ہے۔ ان مدارس میں دینی اور دنیاوی ہر طرح کے علم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ علماء متقدمین میں بعض ایسے حضرات بھی گزرے ہیں جو کسی دینی علم میں بھی مہارت رکھتے تھے اور کسی دنیاوی علم میں بھی۔ مثال کے طور پر الشیخ الرئیس ابوعلی ابن سینا (م ۴۲۸ھ) کی شہرت عظیم طبیب کی حیثیت سے ہے۔ اس کی کتاب 'القانون في الطب' ایک ہزار سال سے طبی نصاب کی اہم ترین کتاب ہے۔ یوروپ کے میڈیکل کالج میں بھی تقریباً پانچ سو سال تک داخل نصاب رہی ہے۔ اسی کے ساتھ فلسفہ میں بھی انھیں درک حاصل تھا۔ تیسری طرف علم تفسیر میں بھی انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں ہیں۔ علامہ علاء الدین ابن نفیس قرشی دمشقی (م ۶۸۷ھ) کا شمار بھی مشہور اطباء میں ہوتا ہے۔ نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے قائم کردہ اسپتالوں میں وہ افسر الاطباء رہے۔ اس کے علاوہ وہ عظیم فقیہ بھی تھے۔ قاہرہ کے مدرسہ مسروریہ میں فقہ شافعی کا درس دیتے تھے۔ اس ضمن میں اندلس کے علامہ ابن رشد قرطبی (م ۵۹۵ھ) کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ بیک وقت طبیب بھی تھے، فلسفی بھی اور فقیہ بھی۔ فقہ میں ان کی کتاب بدایۃ المجتہد، طب میں کتاب الکلیات اب تک مرجع خلائق ہیں اور مشرق و مغرب میں ان سے بھرپور استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی مدارس کے قیام کی ایک زرّیں تاریخ ہے۔ عہد سلطنت میں اور بعد میں مغلیہ عہد میں ملک کے ہر حصہ میں مدارس قائم کیے گئے۔ ان میں تمام مروجہ علوم پڑھائے جاتے تھے۔ ان مدارس کو حکومت کی سرپرستی حاصل رہتی تھی اور ان کا پورا خرچ سرکاری طور پر اٹھایا جاتا تھا۔ ہندوستان سے جب مسلمانوں کی حکم رانی ختم ہوئی اور اس پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو ان مدارس پر افتاد پڑی۔ سرکاری امداد سے محروم ہو جانے کی وجہ سے وہ بند ہو گئے۔ انگریزوں نے اپنا نظام تعلیم جاری کیا۔ اس کے تحت جو تعلیمی ادارے قائم کیے گئے وہ ظاہر ہے کہ انگریزوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے تھے۔ سیاسی یلغار کے ساتھ فکری یلغار کی بھی زبردست کوششیں کی گئیں اور عیسائیت کو خوب بڑھاوا دیا گیا۔ اس صورت حال نے تعلیم کی دوئی پیدا کی اور دینی تعلیم اور غیر دینی تعلیم کے دھارے وجود میں آئے۔ کچھ مسلمانوں کے ذریعہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے جو انگریزی حکومت کی ضروریات پوری کر سکیں اور ان کے لیے سول سرونٹس فراہم کر سکیں۔ دوسری طرف ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی وجود و بقا کے لیے فکر مند اصحاب نے ان کے لیے خالص دینی تعلیم کے ادارے قائم کیے، تاکہ ارتداد سے ان کی حفاظت ہو سکے اور وہ مسلمان رہتے ہوئے یہاں زندگی گزار سکیں۔ علی گڑھ کالج غیر دینی تعلیم کا نمائندہ تھا تو دیوبند کا مدرسہ انھیں دینی تعلیم فراہم کرتا تھا۔ ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، انگریزوں کی حکومت ختم ہو چکی ہے، یہ دونوں دھارے اب بھی متوازی چل رہے ہیں اور اپنی اپنی جگہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ادھر کچھ عرصے سے مسلمانوں کی سوچنے سمجھنے والی اور ان کی فلاح و بہبود سے دل چسپی رکھنے والی شخصیات میں تعلیم کی دوئی کو ختم کرنے یا کم سے کم دونوں نظام ہائے تعلیم کے درمیان قربت پیدا کرنے کی فکر ہوئی اور اس کے لیے انھوں نے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ ایک تدبیر انھوں نے یہ اختیار کی کہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو کچھ انگریزی پڑھا دی جائے اور معاشیات، سیاسیات اور کچھ دوسرے مضامین کی شدھ بدھ فراہم کر دی جائے، تاکہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے بالکل اندھیرے میں نہ رہیں اور جدید تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اپنے دین سے بالکل نابلد رہ جائیں اس کے لیے صباحی اور مسائی تعلیم morning classes اور Evening classes کا انتظام کیا گیا۔ اس تعلق سے زیادہ زور اور محنت دینی تعلیم کے اداروں پر صرف کی گئی۔ مدارس کے نصاب کو out of date قرار دیا گیا، اس کی اصلاح کے لیے زبردست تحریکیں چلائی گئیں، کانفرنسیں منعقد کی گئیں، سمینار اور ورکشاپ کیے گئے، تجویز کردہ نئے نصاب کے مطابق کتابیں تیار کی گئیں۔ دوسری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ دینی مدارس کے فارغین کو جدید مضامین سے واقف کرنے کے لیے خصوصی کورسیز شروع کیے گئے۔ اس سلسلے میں ملک کے مختلف حصوں میں متعدد تجربات ہو رہے ہیں۔ یہ تمام کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ ان کے کچھ ثمرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں؛ لیکن راقم کا احساس ہے کہ دوسری طرف جدید تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے والے بچوں کی دینی تعلیم کی کمی کو پورا کرنے کے لیے جتنی کوششیں مطلوب تھیں، وہ نہ کی جا سکیں۔ (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

سپریم کورٹ کے حالیہ چند فیصلے

ڈاکٹر سلیم خاں

تین طلاق کے سہ رخی بدنام زمانہ فیصلے میں جسٹس جگدیپ سنگھ کھہر نے پرسنل لا کی حمایت میں اپنا سارا زور صرف کردیا اور اسے عدالت کی دسترس سے پرے قرار دے کر عدلیہ کو اس کے احترام کی نصیحت کرڈالی، اس کے بعد حق رازداری پر سرکار کو چیف جسٹس کھہر نے اپنے قہرناک قانونی سفر کو الوداع کہا، ان کی سربراہی میں آئینی بنچ نے حکومت کی ہر دلیل کی دھجیاں اڑا کر عدلیہ کے وقار کو بحال کیا، جدید غیر اعلانیہ ایمرجنسی کے دوران ۹ ججوں کی بنچ نے اتفاق رائے سے قدیم ایمرجنسی کے دوران کئے جانے والے اے ڈی ایم جبل پور بمقابلہ شیوکانت شکلا کے فیصلہ کو منسوخ کردیا، اس فیصلے کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اسے لکھنے والے جسٹس ڈی وائی چوڑ نے خود اپنے والد جسٹس وائی وی چندر چوڑ کے فیصلے کو مسترد کیا ہے، 1957 میں سنائے گئے عدالتی فیصلے میں کہا گیا تھا کہ حق کیا ہے؟ وہ جو دستور نے دیا ہے، یا اس کے وضع کرنے سے پہلے سے ہے، نجی آزادی کا کوئی امتیازی نشان نہیں ہے؛ اس لیے کب سے اسے نافذ کیا جائے، اس کا پتہ لگانا ناممکن ہے، آگے چل کر انہوں نے اور بھی خطرناک بات لکھ دی، اس (بنیادی) حق کا مصدر یا دائرہ کار جو بھی ہو، نجی آزادی کے حق کو جوہری و مادی شکل میں ایمرجنسی کے دوران معطل کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک ایسی خطرناک عدالتی نظیر تھی کہ اس کی آڑ میں کوئی بھی فسطائی حکومت اپنے شہریوں کو بنیادی حقوق سے قانوناً سلب کرسکتی تھی؛ لیکن والد نے جو عظیم غلطی کی تھی، 24 سال بعد بیٹے نے اس کی اصلاح کردی، ڈی وائی چندچوڑ نے لکھا: زندگی اور نجی آزادی انسانی وجود کے ناقابل تقسیم اجزاء ہیں، کیسوانند بھارتی کے کیرالہ حکومت کے خلاف مقدمہ میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے، یہ قانون فطرت کے تحت ملنے والا حق ہے، ایک فرد کی زندگی میں انسانیت کا عنصر زندگی کے تقدس کا جزو لاینفک ہے، (انسانی زندگی کا) وقار حریت اور آزادی سے منسلک ہے، اس وضاحت کے بعد عدالت نے سرکار کو بہ بانگ دہل تلقین کی کہ کوئی مہذب حکومت قانونی اختیار کے بغیر زندگی اور نجی آزادی میں مداخلت کا تصور بھی نہیں کرسکتی، ایک ایسے دور میں جب انسانی حقوق کو دیش بھگتی کے نام پر برسرعام پامال کیا جارہا ہے، سپریم کورٹ نے یہ نادر روزگار فیصلہ سنا کر عوام کے بنیادی حقوق کی بحالی میں قابل ستائش کردار ادا کیا ہے۔

چیف جسٹس دیپک مشرا نے گجرات ہائی کورٹ کا مذہبی مقامات کی مرمت کا فیصلہ مسترد کرکے مایوسی کی لہر دوڑادی، گجرات کے مسلمانوں کی ایک تنظیم اسلامک ریلیف کمیٹی نے 2003 میں احمد آباد کی عدالت میں معاوضے کی درخواست داخل کی تھی، اسلامی کمیٹی کے مطابق فسادات کے دوران پانچ سو سے زیادہ مساجد اور درگاہوں کو تباہ وتاراج کیا گیا، گجرات ہائی کورٹ نے 8 فروری 2012 کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے گجرات سرکار کی سخت سرزنش کی، ہائی کورٹ نے کہا کہ فسادات روکنے میں حکومت کی طرف سے مناسب اقدامات کی کمی، بے عملی اور غفلت کے سبب ریاست میں بڑے پیمانے پر مذہبی عبادت گاہوں کو نشانہ بنایا گیا، منہدم عبادت گاہوں کی تعمیر کا معاوضہ دینے کا حکم دیتے ہوئے عدالت نے کہا کہ حکومت نے جب فسادات میں تباہ ہونے والے مکانوں اور دوکانوں کے لیے معاوضہ ادا کیا ہے تو اسے مذہبی عمارتوں کے لیے بھی معاوضہ دینا چاہئے، ان منہدم عبادت گاہوں کی اگر پہلے ہی تعمیر نو ہوچکی ہے تو جو بھی اخراجات آئیں ہوں، حکومت ان کی ادائیگی کرے، گجرات ہائی کورٹ نے ریاست کے تمام اضلاع کے پرنسپل ججوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں منہدم عبادت گاہوں کی تفصیل حاصل کریں اور ان کے معاوضے طے کریں، اس کام کے لیے 6 ماہ کا وقت دیا گیا تھا۔

گجرات کی صوبائی حکومت نے ہائی کورٹ کے اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کردیا، ریاستی حکومت نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو ناقص قرار دیا، اس کے خیال میں آئین ہند کے سیکولر اصولوں کے تحت کوئی حکومت مذہبی اداروں کو رقم فراہم نہیں کرسکتی، بی جے پی کی ہندوتو وادی سرکار کا مسلمانوں کو ان کے حق سے محروم کرنے کے لیے سیکولرزم کا سہارا لینا حیرت انگیز اور دستور کی دہائی تعجب خیز تھا، حکومت اگر صحیح معنوں میں سیکولر ہوتی تو نہ فسادات رونما ہوتے اور نہ عبادت گاہیں مسمار ہوتیں، اس صورت میں واجپائی جی کو علی الاعلان مودی جی کی خاطر راج دھرم پالن کرنے کا اپدیش بھی نہیں دینا پڑتا، 2012 میں مشرا جی کی قیادت والی سپریم کورٹ نے صوبائی حکومت کی ہائی کورٹ کے فیصلے پر حکم امتناعی کی درخواست کو تسلیم نہیں کیا اور مودی جی کی سرکار کو حکم دیا کہ وہ فسادات میں تباہ ہونے والی عبادت گاہوں اور مساجد کی صحیح تعداد اور ان کی تعمیر نو پر آنے والے اخراجات کے تخمینے کی تفصیلات عدالت عالیہ کے سامنے پیش کرے، حکومت سے عدالت جاننا چاہتی تھی کہ کیا حکومت نے فسادات کے دوران عبادت گاہوں کے حقیقی نقصانات کا کوئی جائزہ لیا ہے، اس کے بعد وقت بدل گیا، ایک ایسا وقت آگیا کہ منموہن سنگھ کے زیر سایہ مشرا جی جس وزیر اعلیٰ کو انہیں نیچا دکھا رہے تھے، اسی کی نظر کرم سے چیف جسٹس بن گئے اور اسی کے ساتھ منظر نامہ بھی تبدیل ہوگیا۔

27 اگست کو سپریم کورٹ نے گجرات ہائی کورٹ کے مذکورہ فیصلے کو مسترد کردیا اور ریاستی حکومت کی معاوضہ والی تجویز کو منظوری دے دی، یعنی اب گجرات حکومت تباہ شدہ مذہبی ڈھانچے کو عمارت مان کر معاوضہ دے گی، گجرات ہائی کورٹ کی تجویز کے مطابق تباہ شدہ عمارتوں کو زیادہ سے زیادہ 50 ہزار روپے نقصان کی بھرپائی کے طور پر دیئے جائیں گے، اب عبادت گاہوں یا مساجد کو مذہب کے نام پر نہیں؛ بلکہ عمارت کے طور پر معاوضہ دیا جائے گا، سپریم کورٹ کی دلیل یہ ہے کہ حکومت کسی بھی مذہبی مقام کی تعمیر یا مرمت کے لیے ٹیکس دہندہ کے پیسے خرچ نہیں کرسکتی، اگر حکومت معاوضہ دینا چاہتی ہے تو اسے مندر، مسجد، گردوارہ، چرچ وغیرہ کو ایک عمارت مان کر نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے۔

اس فیصلے نے کئی سوالات کو جنم دے دیا ہے، مثلاً دستور کی دفعہ 258 میں مندر کی تعمیر کے لیے خرچ کا جواز موجود ہے یا نہیں؟ گجرات کے فسادیوں میں ٹیکس دہندہ شامل تھے یا نہیں؟ ٹیکس کی رقم جن لوگوں کا حق ہے، کیا وہ اس فساد میں ملوث نہیں تھے؟ اگر تھے تو کیا انہیں بلاواسطہ اس نقصان کی بھرپائی نہیں کرنی چاہئے؟ کیا صوبائی حکومت کو اس کی کوتاہی کی سزا نہیں ملنی چاہئے اور اس کا کیا طریقہ ہے؟ ہائی کورٹ کے فیصلے میں حکومت کی کوتاہی کا اعتراف موجود ہے اور سپریم کورٹ نے چونکہ اسے مسترد نہیں کیا؛ اس لیے گویا اسے تسلیم کیا ہے؟ جسٹس دیپک مشرا نے یہ بھی کہا ہے کہ دستور کی دفعہ 27 یہ نہیں کہتی ہے کہ مرکزی یا ریاستی حکومتیں مذہبی مقامات کی مدد کے لیے قانون نہیں بناسکتے، اگر گجرات حکومت نے مذہبی مقامات کی مدد کا قانون بنایا ہوتا اور پھر بھی وہ معاوضہ دیتی تو دیگر بات ہوتی، سپریم کورٹ گجرات کی نام نہاد سیکولر حکومت سے پوچھ سکتا تھا، ایسا قانون کیوں نہیں بنایا گیا اور قانون بنانے کا حکم دے سکتا تھا؛ لیکن یہ نہیں کیا گیا، اس مہنگائی کے دور میں 50 ہزار روپئے سے کوئی معقول مرمت ہوسکتی ہے؟ پھر کس کی مدد دی جائے اور کس کی نہیں، اس کا تعین صوبائی حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، ایک ایسی ریاستی حکومت پر جو تباہ شدہ عبادت گاہوں کی مذکورہ تعداد کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کی نیت مدد کرنے کی ہے ہی نہیں، اس پس منظر میں اے پی سی آر نے بجا طور پر مذکورہ فیصلے پر سپریم کورٹ میں نظرثانی کی درخواست کردینے کا فیصلہ کیا ہے۔

میانمار کے مہاجروں کو لے کر سپریم کورٹ کا ایک ملا جلا فیصلہ آگیا، اس میں عدالت نے یہ تسلیم کیا کہ ملک میں کسی کو رکھنے یا نکالنے کا فیصلہ مقننہ کے دائرہ اختیار میں آتا ہے، اس لیے وہ روہنگیا کے مسلمانوں کی بابت حکومت کے فیصلے کو روک لگانے سے قاصر ہے، پھر بھی اس نے حکومت سے ملک کے اندر موجود مہاجرین کی تفصیل طلب کرکے نادانستہ مسائل پیدا کردیئے ہیں، اس لیے کہ پتہ چلا کہ بنگلہ دیش، تبت اور سری لنکا کے مہاجرین کی تعداد برمی مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، نیپال کے لوگ تو اپنے آپ کو غیر ملکی ہی نہیں سمجھتے، اس کے بعد حکومت کو یہ صفائی پیش کرنی پڑتی کہ اس کا موقف تمام غیر قانونی مہاجرین کے ساتھ یکساں ہے، ابھی حکومت اس جھٹکے سے سنبھل نہ پائی تھی کہ گئو رکشک دہشت گردوں پر مشرا نے نیا زلزلہ برپا کردیا۔

عدالت عالیہ نے گزشتہ سال اکتوبر میں گئو رکشا کے نام پر تشدد کے مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے جن چھ ریاستوں سے تشدد کے مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے ان میں سے پانچ صوبوں مہاراشٹر، گجرات، جھارکھنڈ، ہریانہ اور مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں بی جے پی کی حکومت ہے، مفاد عامہ کی تین عرضیوں پر سماعت کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے مرکزی حکومت سے وکیل مقرر کرنے کا حکم دیا، تحسین پونا والا کی درخواست میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان ریاستوں میں گئو رکشا کے نام پر جاری تشدد کی آزادانہ اور منصفانہ جانچ ہونی چاہئے، 7 اپریل 2017 کو سپریم کورٹ نے مرکزی حکومت کے علاوہ ۶ ریاستوں کو نوٹس جاری کرتے ہوئے غضبناک ہوکر پوچھا کہ کیوں نہ گئو رکشا کے نام پر تشدد کرنے والی جماعتوں پر پابندی لگادی جائے، حکومت کی کاہلی پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے تین ہفتے کے اندر جواب داخل کرنے کی ہدایت جاری کی۔

چیف جسٹس دیپک مشرا کی سربراہی والی بنچ نے اس سنگین معاملے میں ۶ ستمبر ۲۰۱۷ء کو اپنا آخری فیصلہ صادر کیا تو اس میں پابندی کی بات گدھے کی سر سے سینگ کی مانند غائب تھی، خیر غنیمت کہ ہر ضلع میں نوڈل افسر مقرر کرنے کا حکم موجود تھا، ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں سے تاسک فورس تشکیل دینے اور ان میں سینئر پولس افسران کو نوڈل افسر مقرر کرنے کی تاکید کی، عدالت عالیہ نے تشدد کے واقعات کی روک تھام کے لیے ہر ریاست کے چیف سکریٹری سے کہا ہے کہ وہ متعلقہ ڈائرکٹر جنرل آف پولس کی مدد سے قومی شاہراہوں کو گئو رکشکوں سے محفوظ رکھیں، اس بابت سینئر وکیل اندرا جے سنگھ اور کومن گونز الوں نے دلیل دی تھی کہ تشدد کا سہارا لینے والے گئو رکشکوں کے خلاف مرکزی حکومت کے موقف کے باوجود قتل کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔

اس معاملہ میں سرکاری وکیل تشار مہتا کا دفاع نہایت کمزور تھا، ان کے مطابق یہ واقعات نظم ونسق سے متعلق ہیں جو ریاستی حکومت کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں، اس کے خلاف جے سنگھ کی دلیل تھی کہ مرکزی حکومت ان سانحات کو صرف نظم ونسق کا مسئلہ کہہ کر دامن نہیں بچا سکتی، مرکزی حکومت کو آئین کی دفعہ 256 کے تحت ریاستی حکومتوں کو ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے ہدایت دینے کا اختیار حاصل ہے، مہتا نے جب یہ کہا کہ کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کی روک تھام کے لیے قانون موجود ہے، تو چیف جسٹس نے پھٹکار لگائی کہ ہم جانتے ہیں کہ اس کے لیے قانون موجود ہے؛ لیکن آپ نے (حکومت نے) کیا کیا؟ آپ منصوبہ بند طریقہ سے قدم اٹھا سکتے تھے؛ تاکہ گئو رکشا کے نام پر تشدد کے واقعات میں اضافہ نہ ہو، عدالت نے کہا کہ مرکز اور ریاستی حکومتوں کو گئو رکشا کے نام پر تشدد پھیلانے والوں کو روکنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے چاہئیں۔

گئو بھگتی آہستہ آہستہ حکومت کے گلے کی ہڈی بنتی جارہی ہے، عدالت سے پریشان گئو بھگت سرکار کو خود اس کے نومنتخب مرکزی وزیر نے جھٹکا دیا، پہلے یہ معاملہ آسام کے وزیر اعلیٰ تک محدود تھا؛ لیکن اب گوہاٹی دلی آگیا ہے، سرکاری افسر سے سیاست داں بننے والے مرکزی وزیر سیاحت الفونس کنتھانم نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے پہلے دن بیف کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کیرالہ میں بیف بدستور کھایا جاتا رہے گا، وہ بولے بی جے پی نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ بیف نہیں کھایا جاسکتا، (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

تنگ نظر ہندوتو سے کیرل میں کام نہیں چلے گا

راجدیپ سردیسائی (ہندوستان ٹائمز ۱۳؍اکتوبر ۲۰۱۷ء)
ترجمہ: سید محمد عادل فریدی

پچھلے منگل کو ایسا لگا کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت عارضی طور پر نئی دہلی میں اشوک روڈ پر واقع بی جے پی ہیڈ آفس میں شفٹ ہوگئی ہے۔ بہت سے ہائی پروفائل وزراء کا بینہ کیرل میں آر ایس ایس کارکنوں پر کمیونسٹوں کی جانب سے ہونے والے تشدد کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے اسٹوڈیو انٹرویو کے لیے قطار لگائے کھڑے تھے۔ اقتصادی گراوٹ، جی ایس، جاب، روہنگیا، کشمیر سارے مسئلے بھلا دئے گئے، کم از کم کچھ گھنٹوں کے لیے پورے کیرل میں بی جے پی کے ذریعہ زور شور سے نکالی جانے والی ''جن رکشا یاترا'' نے اولیت حاصل کرلی۔ پچھلی بار پارٹی اور سرکار کے درمیان کا فرق تب مٹا تھا، جب اگست میں بی جے پی کے تمام وزراء گجرات راجیہ سبھا کے متنازع الیکشن کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے الیکشن کمیشن کے دروازے پر پہونچے تھے۔

کیرل کی یہ مہم سیاسی وسعت کے لیے بی جے پی کی کبھی نہ ختم ہونے والی پیاس کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ ایسی ریاست ہے جہاں سے کبھی بی جے پی نے پارلیامنٹ کی سیٹ نہیں جیتی اور اسمبلی کی سیٹ بھی ۲۰۱۶ء میں پہلی بار جیتی، ووٹوں میں اس کی حصہ داری ۲۰۱۱ء میں ۶ر فیصد تھی جو اب ۲۰۱۶ء میں بڑھ کر ۱۵ر فیصد ہوگئی ہے۔ پھر بھی امیت شاہ کی قیادت میں نکلنے والی اس ''جن رکشا یاترا'' کو جس طرح سے مایوس کن جواب ملا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکمل کے کھلنے کے لیے کیرل ابھی تیار نہیں ہے۔

بی جے پی صدر نے آناً فاناً کیرل سے دہلی لوٹنے کا فیصلہ کیا، جو بتاتا ہے کہ پارٹی کی قیادت کو یہ احساس ہوگیا کہ یہ ایسی سیاسی سرمایہ کاری تھی جو اسکرپٹ کے مطابق نتیجہ نہیں دے سکی۔ بی جے پی کیرل کی پہیلی کیوں نہیں سلجھا پائی؟ ویسے بھی یہ ایسی ریاست ہے جہاں اقلیت کی آبادی کافی زیادہ ہے، مسلمان اور عیسائی ملا کر پینتالیس فیصد، اس لیے یہاں اکثریتی طبقہ یعنی ہندوؤں کے ووٹ بینک کو مضبوط کرنے کا پورا امکان موجود ہے، آر ایس ایس صوبے میں کئی دہائیوں سے مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے ہوئے ہے، لیفٹ اور کانگریس اشتراکی سیاست سے نوجوانوں کو کوئی بہت زیادہ دلچسپی نہیں ہے، یہاں کمیونسٹوں اور آر ایس ایس کے کارندوں کے درمیان خونی جدوجہد برسوں سے جاری ہے اور ایک دوسرے کو نشانہ بنانے کا عمل لگاتار ہو رہا ہے، بی جے پی کا دعویٰ ہے کہ کمیونسٹ سرکار کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ پرتشدد کارروائی یکطرفہ ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ مودی کا ہندوتو کے ساتھ گڈ گورننس کے دعویٰ لوگوں کو لبھانے کے لیے کافی ہونا چاہئے، وہاں تو مندر اور ٹریڈ یونین ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، مذہب اور ذات پات جیسے عوامل بھی کم نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ کیرل کی عوام بی جے پی کے ایجنڈے سے متاثر نہیں ہو رہی ہے؟

اگر کیرل اب بھی بی جے پی کی مخالفت کر رہا ہے تو اس سے پولرائزیشن پر مبنی سیاست کی حدود ظاہر ہوتی ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں بی جے پی کو قومی سیاست کے ماہر کھلاڑی کے طور پر پیش کرنے والی رام مندر تحریک اسی پولرائزیشن کے ایجنڈے کے ذریعہ آپریٹ ہو رہی تھی، جس کا مقصد ہندو اور مسلم کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرنا تھا، جارحانہ ہندوتو والی سیاسی پہچان کو ''تاریخی مظالم'' کا بدلہ لینے پر زور دے کر اور زیادہ مضبوط کیا گیا جس کے نتیجے میں مسجد کو شہید کرنے جیسا گھناؤنا، مجرمانہ اور شرمناک عمل بھی ہوا۔

اس کے برخلاف کیرل کی ہندو سیاسی روایات کی جڑیں بیسویں صدی کی سماجی اصلاحی تحریک میں پیوست ہیں جن کا مقصد ہندو معاشرہ کو اندر سے تبدیل کرنا تھا۔ خاص طور پر مندر میں داخل ہونے کی تاریخی تحریک نے برہمن رسم ورواج کے غلبہ کو ختم کردیا، ذات پات کی رکاوٹیں ختم کر دیں اور زیادہ سیکولر معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔ پوجا کرنا کبھی کا بنیادی حق بنا، جہاں گائے کی پرستش ہندوؤں کے بنیادی مذہبی عقائد میں شامل نہیں تھی، کیرل کی ہندو سیاست اقلیتوں کو نشانہ بنانے والے بھگوا دھاری سوامیوں اور مہنتوں کی سیاست نہیں تھی بلکہ وہ نارائن گرو جیسی عظیم شخصیت کی سماجی اصلاح کی سیاست تھی، جنہوں نے مذہبی فرقہ پرستی کو چیلنج کر کے روحانی آزادی اور سماجی مساوات پر زور دیا۔ کیرل مذہبی پولرائزیشن کے خلاف کیوں رہا، یہ سمجھنا ہو تو نارائن گرو کی زندگی اور ان کی تعلیمات کو سمجھنا ہوگا۔ مذہبی شخصیت کے حامل نارائن گرو موثر طریقہ پر انسانی اقدار پر مبنی معاشرہ کی تشکیل کی بات کرتے تھے۔ وہ انسان کے لیے ایک ذات، ایک مذہب اور ایک خدا کی بات کرتے ہوئے ذات پات کی تفریق سے بالاتر ایسے سماج کی حمایت میں مضبوطی کے ساتھ بولتے تھے جو حقیقت میں مساوات کا آئینہ دار ہو، انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ آدمی کا مذہب خواہ کچھ بھی ہو اتنا کافی ہے کہ وہ اسے ایک اچھا انسان بنائے، ان کا نظریہ ہندو راشٹر کی سیاست کا نہیں تھا، جس کا مقصد اکثریتی ہندو تہذیب کے سایے میں تمام دیگر مذہبی تہذیبوں کو ختم کرنا ہے۔ نارائن گرو ایسے مختلف العقائد سماج کی تشکیل پر زور دیتے تھے جو رواداری اور ایک دوسرے کے احترام پر مبنی ہو۔ مساوات اور شمولیت کے اسی آزادانہ جذبے نے کیرل کی سیاست کی تشکیل کی۔ پھر خواہ موقع بموقع فرقہ وارانہ تقسیم کی کوشش ہی کیوں نہ ہوئی ہو، لیکن کیرل کی اس رواداری والے سیاسی نظریہ میں شگاف ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔

آپ نارائن گرو کا اتر پردیش میں ہندوتو کی سیاست کی پہچان بنے نئے پوسٹر بوائے یوپی کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کے ساتھ تقابل کریں، جن کا سیاسی عروج ہی مسلمانوں کے خلاف تشدد اور نفرت آمیز ہر ریلی تقریریں کرنے کے ذریعہ ہوا۔ انہیں کیرل میں اپنی تحریک کا مرکزی چہرہ بنا کر بی جے پی نے فرقہ وارانہ آواز کو اونچا اٹھانے کی غلطی کی، ''لو جہاد'' کا نعرہ اتر پردیش کے پچھڑے علاقوں میں توجہ کا باعث بنتا ہوگا لیکن صد فیصد تعلیم یافتہ ہونے کا جشن منانے والے صوبے میں یہ ان لوگوں کو مخالفت میں کھڑا کردے گا، جو اسے سماج کو تقسیم کرنے کی جان بوجھ کر کی جانے والی کوشش سمجھتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بی جے پی کیرل میں بڑھ نہیں سکتی، اگر مسلمانوں میں سیاسی فرقہ پرستی بڑھتی ہے، اگر کیفٹ کی حکومت سیاسی تشدد کے واقعات پر لگام نہیں لگا پاتی، اگر کانگریس میں توانائی اور اتحاد کا فقدان جاری رہتا ہے تو صوبے میں بی جے پی کا مستقبل روشن ہے۔ لیکن آگے بڑھنے کے لیے اسے تنگ نظر ہندوتو کا نظریہ چھوڑنا ہوگا۔ کیرل کو نفرت سے نہیں رواداری سے ہی جیتا جاسکتا ہے۔

پوسٹ اسکرپٹ: جس دن بی جے پی کی کیرل مہم قومی نیوز چینلوں پر شہ سرخی میں تھی مقامی میڈیا کے فوکس میں دوسرے کئی اہم معاملے تھے۔ ملیالم فلموں کے سوپر اسٹار دلیپ اغوا اور تشدد کے الزام میں کئی مہینے جیل میں رہنے کے بعد ضمانت پر رہا ہوئے تھے، کم سے کم کیرل کی میڈیا کے لیے تو کسی سیاسی ڈرامہ کے مقابلہ میں اپنے محبوب فلم اسٹار کی ڈرامائی کہانی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ہم دہلی میں بیٹھے میڈیا کے لوگوں کے ساتھ ساتھ دہلی کے سیاست دانوں کو بھی Tyranny of distance (فاصلے کی تاناشاہی) کو سمجھنا ہوگا، انہیں پتہ ہونا چاہئے کہ ہنوز تروونت پورم دور است۔

خبروں پر جھوٹ کا سایہ

گووند سنگھ (امر اجالا ۱۲؍اکتوبر ۲۰۱۷ء)
ترجمہ: سید محمد عادل فریدی

جس سپریم کورٹ نے دو سال پہلے سوشل میڈیا کی گالی گلوج کو نظر انداز کرتے ہوئے، آئی ٹی ایکٹ کی دفعہ 66(A) کو نظر انداز کردیا تھا، آج اسی عدالت کو لگ رہا ہے کہ سوشل میڈیا پر لگام لگانی ضروری ہے۔ سپریم کورٹ کا خیال ہے کہ سوشل میڈیا کا غلط استعمال ہو رہا ہے، اس کے ذریعہ غلط معلومات نشر کی جارہی ہیں، جھوٹی خبریں پیش کی جارہی ہیں۔ دوسروں کے خلاف جارحانہ اور بھدے تبصرے کیے جارہے ہیں، پرائیویسی کی کھلے عام خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ سرکاروں، کمپنیوں، سیاسی لیڈروں اور سیاسی پارٹیوں نے اپنے بارے میں مثبت اور مخالفین کے خلاف منفی خبریں پھیلانے کے لیے ماہرین کی ٹیمیں جمع کر رکھی ہیں۔ فرضی خبریں بنانے والوں اور اور پھیلانے والوں کی ایک نئی فوج کھڑی ہوگئی ہے، جن کا کام ہی افواہیں پھیلانا اور جھوٹی خبریں شائع کرنا ہے، سپریم کورٹ نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ سوشل میڈیا پر نکیل کسنے کے لیے قانون بنانے کی سخت ضرورت آن پڑی ہے۔ حقیقت میں عدالت کے بجائے مقننہ کو اس سلسلہ میں پہل کرنے کی ضرورت ہے۔

سوشل میڈیا کے ذریعہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لینا تو کچھ حد تک سمجھ میں آتا ہے، لیکن جس طرح سے سوشل میڈیا آج افواہوں، جھوٹی خبروں اور ایک دوسرے کی توہین وتذلیل کا اکھاڑا بن کر رہ گیا ہے، اس سے سوشل میڈیا کے وجود پر ہی سوالیہ نشان لگنے لگا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں پر کوئی بھی کچھ بھی بکنے کے لیے آزاد ہے، کسی پر بھی کیچڑ اچھالنے، کسی کی بھی توہین کرنے اور عزت اچھالنے کا لائسنس ہر انسان کو مل گیا ہے، اب انفرادی طور پر لوگوں پر تبصرے کرنے سے آگے بڑھ کر لوگوں نے ذات، مذہب، طبقہ اور مسلک کے بیچ میں نفرت پھیلانے کا کام شروع کردیا ہے۔ دوسرے مذاہب کی عظیم شخصیات کے خلاف ہی نہیں ایک دوسرے کے معبودوں کے خلاف بھی کیچڑ اچھالنے سے نہیں ڈرتے، سیاسی رنجش کا بہت ہی گھناؤنا چہرہ سامنے آرہا ہے، یہاں تک کہ عدالتوں اور ججوں کو بھی بخشا نہیں جاتا۔ سچی خبروں اور ملمع کی ہوئی خبروں کے بیچ میں تفریق کر پانا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ لگتا ہے کہ ہم افواہوں کے جنگل میں داخل ہوگئے ہیں، جہاں کوئی بھی کچھ بھی بول سکتا ہے، ایسا کر کے سوشل میڈیا خود اپنے لیے ہی خندق کھود رہا ہے۔ بدقسمتی ہے کہ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر بھی اس کے اثرات پڑ رہے ہیں۔ جب بھی کوئی نئی میڈیا سامنے آتی ہے، اپنے ساتھ کچھ اچھائیاں اور کچھ برائیاں ساتھ لے کر آتی ہے۔ سماج اور حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے برے اثرات سے بچنے کی تیاری کریں۔ مغربی ممالک جہاں سے ان ذرائع وسائل کی ایجاد ہوئی انہوں نے وقت رہتے ہی اپنے سماج کے لیے اس کا حل بھی تلاش کرلیا۔ چین جیسے ملک نے ان پر یا تو مکمل پابندی لگا دی یا مضبوط فلٹر کھڑے کردیے۔ ہم بہت دیر سے جاگتے ہیں، وہ بھی مقننہ کے بجائے عدالت کے بیدار ہونے سے۔

کہا جارہا ہے کہ ملک میں موبائیل فون کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہو گئی ہے۔ انٹرنیٹ والے اسمارٹ فونوں کی تعداد بھی ستر کروڑ سے کم نہیں ہوگی۔ یہ تعداد تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ مٹھی بھر سمجھدار لوگوں کو چھوڑ دیا جائے تو بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جو چھپے ہوئے الفاظ کو وحی الٰہی سمجھتے ہیں۔ وہ افواہوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور جھوٹی خبروں کو سچ مان لیتے ہیں۔ گاؤں کے عام لوگوں میں سچ اور جھوٹ میں فرق کر پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ فیس بک یا ٹوئیٹر کو ہینڈل کرنے والوں نے کچھ کوششیں کی ہیں۔ گوگل، فیسبک اور ٹوئٹر ہمارے پوسٹ اور شیئرنگ پر لگا تار نظریں رکھتی ہیں، اور وہ اس کام کو بخوبی انجام دیتے ہیں ہولڈنگ کمپنی الفابیٹ کے تحت ہینڈل ہونے والا گوگل دنیا کا سب سے بڑا میڈیا گروپ ہے، زیٹھ میڈیا کے مطابق ۲۰۱۶ء میں گوگل نے اشتہارات کے ذریعہ 79.4 ارب ڈالر کم کمائی کی ہے، اشتہارات سے کمائی کے معاملہ میں فیس بک دوسرے نمبر پر ہے، جھوٹ کے کاروبار میں بے شمار پیسہ ہے، اور تمام سوشل میڈیا پلیٹ فارم اور اس کے بنانے والے اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ آخر کار بزنس مین ہیں اصل ذمہ داری تو ہماری ہے، جھوٹ اور نفرت کا کاروبار ہمیں کہیں کا نہ ہیں چھوڑے گا۔ اگر تکنیک جھوٹ اور نفرت کا کاروبار کرنا شروع کردے تو انسانیت کے لیے اس سے نجات کا راستہ تلاش کرنا ہی ہوگا۔

سید محمد عادل فریدی

شمالی کیلیفورنیا میں آتش زدگی، ۳۱ ہلاک

شمالی کیلی فورنیا کے جنگلوں میں لگی بھیانک آگ کی وجہ سے اب تک کم از کم ۳۱؍افراد کی موت ہوگئی جبکہ سینکڑوں لاپتہ ہیں۔جمعرات کومزید ۸؍افراد کے مرنے کی تصدیق ہوئی ہے۔ اس طرح مرنے والوں کی تعداد بڑھ کر۳۱؍پہنچ گئی ہے۔(یواین آئی)

ویتنام میں سیلاب: مرنے والوں کی تعداد ۵۴ ہوگئی

شمالی اور وسطی ویتنام میں اس ہفتہ آنے والے خوفناک سیلاب میں مرنے والوں کی تعداد بڑھ کر۵۴؍ہوگئی ہے اور۳۹؍افرادلاپتہ بتائے جارہے ہیں۔سرکاری ٹیلی ویژن نے وزیرزراعت نگ ین جوان کونگ کے حوالہ سے بتایا کہ پیرکوآنے والاخوفناک سیلاب گزشتہ کچھ برسوں کے سیلاب سے کہیں زیادہ بھیانک ہے۔(یواین آئی)

امریکہ اوراسرائیل یونیسکو کی رکنیت سے دست بردار

امریکہ اوراسرائیل نے اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم (یونیسکو) پر یہودیوں کے خلاف تعصب برتنے کا الزام عائد کرتے ہوئے تنظیم کی رکنیت سے دستبرداری کا اعلان کردیا۔امریکہ کا کہنا ہے کہ یونیسکو اسرائیل کے معاملے پرجانبداری کا مظاہرہ کررہا ہے۔امریکی محکمہ خارجہ کی ترجمان ہیتھرنوریٹ نے اپنے بیان میں کہا کہ جلدایک مبصرمشن تشکیل دیا جائے گا جو یونیسکو میں امریکہ کی نمائندگی کرے گا۔(یواین آئی)

الفتح اورحماس کے درمیان دس سال بعد صلح

فلسطین کے مغربی کنارے اورغزہ کی سخت حریف جماعتوں کے مابین دیرینہ تنازعات پر کامیاب مذاکرات کے بعد دونوں جماعتوں کے درمیان صلح ہوگئی ہے۔حماس اور الفتح کے مرکزی قائدین مصالحاتی عمل کے لیے ۱۰؍اکتوبر سے مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں موجود تھے۔حماس کے سربراہ اسماعیل حانیہ نے الفتح کے ساتھ ہونے والی صلح کی تصدیق کردی ہے۔واضح ہو کہ الفتح اور حماس کے درمیان ۲۰۰۷ء میں شدید اختلافات ہو گئے تھے،جس کے بعد الفتح نے مغربی کنارے اورحماس نے غزہ پر کنٹرول حاصل کررکھا تھا،تاہم چندروز قبل ہی حماس نے فلسطینی اتھارٹی سے مذاکرات بحال کرتے ہوئے غزہ کی انتظامی کمیٹی تحلیل کرنے کا اعلان کیا اور قومی مفاہمتی پالیسی تشکیل دینے کی تجویز پرغورکیا۔غزہ پرکنٹرول ختم کرنے کے اعلان کے بعد فلسطینی صدر نے غزہ کا دورہ کیا جس میں مفاہمتی عمل آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا، جب کہ حماس نے انتظامی امور فلسطینی اتھارٹی کے حوالے کرنے کے لیے تمام رکاوٹیں دورکرنے کی یقین دہانی کرائی۔(نیوز ایکسپریس)

وہ ممالک جہاں لڑکیوں کا اسکول جانا مشکل ہے

امیر اور ترقی یافتہ ممالک میں اسکولوں کے حوالے سے بحث کے موضوعات میں اہم ہوتا ہے کہ کس مضمون کو زیادہ اہمیت دی جائے، کس میں طلبا کوزیادہ مدد کی ضرورت ہے اورکس میں زیادہ وسائل لگانے چاہئیں۔لیکن ترقی پذیر اورغریب ممالک میں سوال انتہائی بنیادی ہوجاتا ہے، کہ کیا بچوں کوسکولوں تک رسائی بھی حاصل ہے یانہیں۔اقوام متحدہ کے اعداد وشمار کے مطابق گذشتہ ایک دہائی میں دنیا کے غریب ترین ممالک میں اسکولوں کی کمی کے مسئلے پرکوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ایک دوسری رپورٹ میں معیارِتعلیم کے بارے میں بتایا گیا کہ ساٹھ کروڑ بچے اسکول تو جاتے ہیں لیکن وہاں کچھ سیکھتے نہیں۔دس ممالک میں سے بیشتر میں لڑکیوں کے اسکول نہیں ہیں۔ان بدحال ممالک میں کئی خاندان غریب ہیں یاان کی صحت خراب ہے، یا پھر وہ غذائیت کی کمی اور جنگ یالڑائی کی وجہ سے بے گھر ہیں۔کئی نوجوان لڑکیوں کوتعلیم حاصل کرنے جانے کے بجائے کام کرنا پڑتا ہے۔کئی کی کم عمری میں شادی کردی جاتی ہے جس کے بعد تعلیم کے مواقع ختم ہوجاتے ہیں۔ذیل میں دنیا کے ان دس ممالک کی فہرست ہے، جن کا ریکارڈ لڑکیوں کی تعلیم کے مقابلہ میں سب سے خراب ہے۔

۱۔جنوبی سوڈان:۔حال ہی میں معرضِ وجود میں آنے والے ملک جنوبی سوڈان کو جنگ اور تشدد کا سامنا ہے۔ یہاں اسکولوں کوتباہ کردیا گیا اورلوگوں کو جبراً بے گھر کیا گیا۔یہاں لگ بھگ ۷۵؍فیصد لڑکیاں پرائمری تک بھی تعلیم مکمل نہیں کرپاتی ہیں۔

۲۔سنٹرل افریقن ریپبلک (سی اے آر):۔یہاں سرکاری اسکولوں کی حالت بہت خستہ ہے، ۸۰؍بچوں کے لیے ایک استاد ہے۔لڑکیوں کی تعلیم پرتوجہ بہت کم دی جاتی ہے۔

۳۔نائجیریا:۔نائجر میں ۱۷ سے ۲۴ سال کی خواتین میں سے صرف ۱۷؍فیصد تعلیم یافتہ ہیں۔

۴۔افغانستان:۔افغانستان میں بھی اسکول جانے والے لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی تعداد کافی کم ہے۔

۵۔چاڈ:۔اس افریقی ملک میں لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں متعدد معاشی اور معاشرتی رکاوٹیں حائل ہیں۔

۶۔پپوانیوگنی:۔گنی میں ۲۵؍سال سے زائد عمر کی خواتین اوسطاً ایک برس تک تعلیم حاصل کرتی ہیں۔

۷۔برکینا فاسو:۔یہاں سکینڈری تک تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیاں صرف ایک فیصد ہیں۔

۸۔لائبیریا:۔پرائمری تک تعلیم حاصل کرنے کی عمر کے دوتہائی بچے اسکولوں سے باہر ہیں۔

۹۔ایتھوپیا:۔یہاں ہر پانچ میں سے دولڑکیوں کی شادی ۱۸؍سال سے کم عمر میں کردی جاتی ہے، جس کی وجہ سے انہیں تعلیم کا موقع نہیں ملتا ہے۔

۱۰۔مالی:۔یہاں صرف ۳۸؍فیصد لڑکیاں ہی پرائمری تک تعلیم حاصل کرپاتی ہیں۔

اساتذہ کی کمی تمام غریب ممالک میں عام ہے۔گذشتہ برس اقوامِ متحدہ کا کہنا تھا کہ دنیا بھی میں تعلیم کے حوالے سے کیے گئے وعدوں کی تکمیل کے لیے کم سے کم چھ کروڑ نوے لاکھ اساتذہ بھرتی کیے جانے کی ضرورت ہے۔ رپورٹ کے مطابق اگرلڑکیوں کو بھی تعلیم فراہم کی جائے تو اس کے اقتصادی فوائد حاصل ہوں گے۔

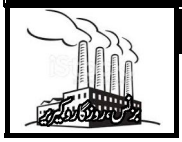

محکمہ اقلیتی فلاح؛ اعلان برائے اسکالرشپ

وزارت اقلیتی امور حکومت ہند نئی دہلی کے ذریعہ مرکزی سیکٹر کے اقلیتی وظیفہ (پری میٹرک/ پوسٹ میٹرک/ میرٹ کم مینس اسکالرشپ) منصوبہ کے تحت تعلیمی سال ۲۰۱۷-۲۰۱۸ کے لیے ریاست کے اقلیتی طلبہ وطالبات (فریش/ رینیول) کے لیے آن لائن درخواست مطلوب ہے۔

تعلیمی سال ۲۰۱۷-۲۰۱۸ کے لیے اسکالرشپ منصوبہ کے تحت سرکاری یا منظور شدہ اسکول/ کالج/ یونیورسٹی/ ادارہ میں زیر تعلیم اقلیتی طبقہ کے طلبہ وطالبات جنھوں نے گذشتہ آخری امتحان میں کم از کم ۵۰ فیصد نمبرات حاصل کیے ہوں (درجہ اول کو چھوڑ کر) وہ حکومت ہند کے نیشنل اسکالرشپ پورٹل کے ویب سائٹ www.scholarships.gov.in پرآن لائن فارم بھر سکتے ہیں۔

آن لائن درخواست دینے کی طے مدت:

☆ اقلیتی وظیفہ (پری میٹرک/ پوسٹ میٹرک/ میرٹ کم مینس) منصوبہ کے تحت اقلیتی طلبہ وطالبات (فریش و رینیول) کے ذریعہ آن لائن فارم بھرنے کی آخری تاریخ ۳۱؍اکتوبر ۲۰۱۷ء تک بڑھادی گئی ہے۔

☆ نیشنل اسکالرشپ پورٹل پر رجسٹرڈ تعلیمی ادارے کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اپنے تعلیمی ادارے سے متعلق اقلیتی طلبہ وطالبات کی آن لائن درخواستوں کو مورخہ ۱۵؍نومبر ۲۰۱۷ء تک آن لائن تصدیق کرتے ہوئے اگلی سطح تک روانہ کردیں۔واضح ہو کہ سبھی درخواستوں کا ادارے کی سطح سے تصدیق شدہ (Verify) ہونا لازمی ہے۔

مزید معلومات کے لیے محکمہ اقلیتی فلاح حکومت بہار کی ویب سائٹ minoritywelfare.bih.nic.in پرلاگ ان کریں یا نیشنل اسکالرشپ پورٹل کی ویب سائٹ www.scholarships.gov.in پرجائیں۔

اسکولوں میں سیکورٹی کے تعلق سے سبھی ہدایات پرعمل کیا جائے: سپریم کورٹ

سپریم کورٹ نے سبھی ریاستی حکومتوں کو یہ یقین دہانی کرنے کی ہدایت دی ہے کہ ملک کے ہراسکول میں بچوں کے تحفظ سے متعلق مرکزی حکومت کی سبھی گائڈ لائنز پرعمل کیا جائے۔چیف جسٹس دیپک مشرا کی قیادت میں بنی بنچ نے سبھی ریاستوں کے پرنسپل سکریٹری کو یہ یقین دہانی کرانے کے لیے نوٹس بھی جاری کی ہے۔(ایجنسی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ اورتائیوان یونیورسٹی میں معاہدہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ اورتائیوان کی نیشنل کاؤسنگ نارمل یونیورسٹی کے بیچ اکیڈمک تعاون کوآگے مضبوط کرنے کے لیے ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے ہیں۔اس کے تحت دونوں یونیورسٹیاں سائنس، آرٹس، فائن آرٹس اور صنعتی تعلیم اور ریسرچ کے شعبوں میں ایک دوسرے کا تعاون کریں گی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک اعلیٰ افسر نے بتایا کہ اس معاہدہ کے تحت دونوں یونیورسٹیاں اکیڈمک سرگرمیوں کوآگے بڑھانے کے لیے مشترکہ سیمناروں، کانفرسوں کا انعقاد اور طلبہ وطالبات کے باہمی تبادلے کے علاوہ مشترکہ طور پر ڈپارٹمنٹل ریسرچ جیسے کام کریں گے۔(ایجنسی)

تین لاکھ نوجوانوں کونوکری کے لیے بیرون ملک بھیجے گی مودی سرکار

مرکز کی مودی حکومت تین لاکھ نوجوانوں کونوکری کے لیے جاپان بھیجنے کا منصوبہ بنارہی ہے۔ان نوجوانوں کو وہاں آن جاب ٹریننگ کے لیے بھیجا جائے گا۔سرکار کے مطابق ان نوجوانوں کو تین سال سے پانچ سال کے لیے یہاں بھیجا جائے گا۔اس دوران ان نوجوانوں کا پوراخرچ جاپانی حکومت اٹھائے گی۔جب ٹریننگ پوری ہوجائیگی توان میں سے کچھ نوجوانوں کو وہیں نوکری بھی دی جائے گی۔مرکزی حکومت کے وزیر برائے اسکل ڈیولپمنٹ اینڈ انٹرپریز شپ دھرمیندر پردھان نے بتایا کہ حکومت ہند اور جاپان کے بیچ ٹیکنیکل انٹرن ٹریننگ پروگرام (TIIP) کے لیے معاہدہ نامہ کومنظوری حاصل ہوگئی ہے۔تین لاکھ نوجوانوں کواگلے تین سال کے دوران جاپان بھیجا جائے گا ان میں سے پچاس ہزار نوجوانوں کوجاپان میں ہی نوکری کا موقع ملے گا۔اور جو نوجوان ٹریننگ کے بعد واپس ملک لوٹیں گے، انہیں بھی انڈین انڈسٹیل فیلڈ میں نوکری کا موقع ملے گا۔(آج تک نیوز سروس)

نقیب کے لیے ''مینیجر'' کی ضرورت؛ درخواستیں مطلوب

امارت شرعیہ کا ترجمان ہفتہ وار اردو اخبار ''نقیب'' تسلسل کے ساتھ ۸۶ سالوں سے شائع ہورہا ہے اور اردو داں حلقہ میں اسے کافی پذیرائی حاصل ہے۔امارت شرعیہ کو اس اخبار کے مینیجر کے عہدہ کے لیے ایک باصلاحیت وتجربہ کار شخص کی ضرورت ہے۔

خواہشمند حضرات ۱۵؍نومبر ۲۰۱۷ء تک اپنی درخواست مع بایوڈاٹا دفتر امارت شرعیہ میں بھیج دیں۔ ایسے لوگوں کوترجیح دی جائے گی جو کسی اخبار سے وابستہ رہے ہوں اوراس کام کا کم از کم ۵ سال کا انتظامی تجربہ رکھتے ہوں۔درخواست بنام امیر شریعت دی جائے اور مندرجہ ذیل پتے پر بذریعہ ڈاک ارسال کیا جائے۔امیدواروں کا انٹرویو مورخہ ۲۱؍نومبر ۲۰۱۷ء مرکزی دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ میں ہوگا۔

Nazim Imarat Shariah
Phulwari sharif, Patna-801505

یا nazimimaratshariah@gmail.com پرای میل کردیا جائے۔

مزید معلومات کے لیے مندرجہ ذیل فون نمبر پر دفتر کے اوقات صبح ۹؍بجے سے شام ۵؍بجے تک رابطہ کرسکتے ہیں: 0612-2555668,2555351

طب وصحت

وٹامن ڈی کی کمی کے نقصانات

وٹامن ڈی ہماری مجموعی صحت کو درست رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جبکہ اس کی کمی بہت سے مسائل کا باعث بن سکتی ہے۔ وٹامن ڈی ہماری مجموعی صحت کو درست رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جبکہ اس کی کمی بہت سے مسائل کا باعث بن سکتی ہے۔ وٹامن ڈی کی کمی کے شکار لوگوں کو اکثر دھوپ میں زیادہ وقت گزارنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، لیکن یہ بتانا ممکن نہیں ہو پاتا کہ آپ کو کتنا وقت دھوپ میں گزارنا چاہیے، کیونکہ دھوپ کی ضروری مقدار کا انحصار دوسری چیزوں پر بھی ہوتا ہے۔ ان میں آپ کی جلد کی رنگت، آپ کی جلد کا کتنا حصہ دھوپ میں ہے، سال کے کس وقت اور دن کے کس پہر آپ دھوپ سینک رہے ہیں وغیرہ شامل ہیں۔ زیادہ ترتجویز کیا جاتا ہے کہ صبح 11 بجے سے سہ پہر 3 بجے کے درمیان کا وقت دھوپ سینکنے کے لیے بہترین ہے۔ دوسرے عناصر جو وٹامن ڈی کی کمی کی وجہ بنتے ہیں ان میں سبزیوں تک محدود خوراک بھی شامل ہے— غذائی لحاظ سے کچھ مچھلیاں، بعض مچھلیوں کے جگر سے نکالا ہوا چربی دار تیل، انڈوں کی زردی اور ڈیری مصنوعات وٹامن ڈی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ابھی تک مکمل طور پر سمجھا نہیں جا سکا ہے کہ وٹامن ڈی جسم میں کس طرح کام کرتا ہے اور ہماری مجموعی صحت پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے، مگر یہ بات صاف ہے کہ وٹامن ڈی مجموعی طور پر ایک بہتر صحت کے لیے اہم ہے اور ہمارے دل، پھیپھڑوں، پٹھوں اور دماغ میں کام کرنے کی صلاحیت کو درست رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جبکہ اس کی کمی بہت سے مسائل کا باعث بن سکتی ہے۔ وٹامن ڈی جسم کو کیلشیم جذب کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے جو ہڈیوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کے جسم میں وٹامن ڈی کی کمی ہوگی تو کیلشیم بھی مناسب مقدار میں جذب نہیں ہو پائے گا، اس طرح آپ کی ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں اور فریکچرز کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ تحقیقات بتاتی ہیں کہ جن خواتین میں بہتر سطح پر وٹامن ڈی موجود ہوتا ہے انہیں آرتھرائٹس مرض کا خدشہ کم ہوتا ہے اور جن لوگوں میں وٹامن ڈی کی کمی ہوتی ہے انہیں آرتھرائٹس کی تکلیف اور شدید علامات سے گزرنا پڑتا ہے۔

دانتوں کی مضبوطی

دانتوں کے امراض اور وٹامن ڈی کے درمیان بہت قریبی تعلق ہے؛ وٹامن ڈی کی سطح جتنی کم ہوگی اتنی ہی زیادہ دانتوں کی صحت خراب ہوگی۔ جن لوگوں میں وٹامن ڈی کی کمی ہوتی ہے ان میں دانتوں کے گرنے کی شرح ان لوگوں کے مقابلے بہت زیادہ ہوتی ہے جن میں وٹامن ڈی کی مقدار زیادہ پائی جاتی ہے۔

دمہ

وٹامن ڈی دافع ورم اثرات والے پروٹین کی پیداوار بڑھانے سے دمہ کنٹرول کرنے میں مدد فراہم کرسکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھیپھڑوں میں ورم کی وجہ بننے والے پروٹین کو بھی بلاک کر دیتا ہے۔

ذیابیطس

بہت ساری تحقیقات کے ذریعے یہ معلوم ہوا ہے کہ وٹامن ڈی انسولین کے اخراج اور انسولین کی حساسیت پر اپنے اثرات کے ذریعے جسم میں گلوکوز کو برداشت کرنے میں مدد فراہم کرسکتا ہے۔

وٹامن ڈی کی کمی کئی دوسرے امراض کا باعث بن سکتی ہے جن میں ہائی بلڈ پریشر اور دل کی بیماریاں، ڈپریشن، الرجیز، انفلوئنزا) وبائی زکام (اور کچھ اقسام کے کینسر بھی شامل ہیں۔

وٹامن ڈی کی کمی کی مخصوص واضح علامات نہیں ہیں، کچھ لوگوں میں وٹامن ڈی کی کمی ہوتی ہے مگر ان میں کوئی بھی علامت دیکھنے کو نہیں ملتی مگر اس بارے میں اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کرنا بہتر ہوگا۔

اگر آپ کو تھکاوٹ، پٹھوں کے درد/اکڑن اور کمزوری، جوڑوں کے درد، وزن کے بڑھنے، ہائی بلڈ پریشر، نیند میں کمی، غائب دماغی، سر درد، مثانے کے مسائل، قبض یا ڈائریا جیسے مسائل کا سامنا ہے تو وہ وٹامن ڈی کے لیول کی تصدیق کے لیے آپ کو ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیں گے۔

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان علامات کی موجودگی صرف وٹامن ڈی کی موجودگی کے باعث ہو اور آپ خود سے ہی ادویات لینا شروع کر دیں۔

یاد رکھیں، اگر آپ دھوپ یا غذا کے ذریعے وٹامن ڈی مناسب مقدار میں حاصل نہ کر سکتے ہوں، تو سپلمنٹس کی صورت میں بہت زیادہ مقدار میں بھی وٹامن ڈی حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن انھیں ڈاکٹر کی تجویز کردہ خوراک سے زیادہ ہرگز استعمال نہ کریں۔

ہفتہ رفتہ | ہفتہ رفتہ | ہفتہ رفتہ | ہفتہ رفتہ | راشد العزیزی ندوی

دارالعلوم الاسلامیہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا معائنہ

مفتی نذر توحید مظاہری نے کیا طلبہ کے درمیان خطاب

دارالعلوم الاسلامیہ امارت شرعیہ کا قائم کردہ صوبہ بہار کا موقر ادارہ ہے، جہاں درس نظامی کے مطابق فضیلت تک کی معیاری تعلیم ہوتی ہے، بیس سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار اساتذہ ساڑھے چار سو طلبہ کی تعلیم و تربیت پر شب و روز مامور ہیں۔ وقتاً فوقتاً ملک و بیرون ملک کی موقر و معتبر علمی شخصیات اس ادارے کا معائنہ کرتی رہتی ہیں اور یہاں کے طلبہ کی علمی و عملی کارگذاریوں کا جائزہ لیتی ہیں، اس سے جہاں ایک طرف یہاں کے طلبہ و اساتذہ کے جد و جہد اور کاوشوں کو مہمیز ملتی ہے تو دوسری طرف اس ادارے کی حصولیابیوں سے بھی عوام کو خواص کو واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اسی سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی نذر توحید مظاہری قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ چترا، مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ رشید العلوم چترا اور رکن شوریٰ و عاملہ امارت شرعیہ بہار و اڈیشہ و جھارکھنڈ کی قیادت میں موقر علماء کرام کے ایک وفد نے دارالعلوم الاسلامیہ کی علمی و عملی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ اس وفد میں مولانا منظور عالم صاحب قاسمی رکن شوریٰ و عاملہ امارت شرعیہ، مولانا امتیاز احمد قاسمی استاذ جامعہ رشید العلوم چترا شریک تھے۔ علمی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد طلبہ و اساتذہ کے مجمع سے حضرت مفتی صاحب موصوف نے خطاب بھی کیا، اپنے خطاب میں انہوں نے طلبہ کے سامنے علم دین کی اہمیت و ضرورت کو کافی تفصیل کے ساتھ بیان کیا، انہوں نے کہا کہ موجودہ حالات میں نہایت ضروری ہے کہ ہم قرآن و حدیث اور قوانین شریعہ کا گہرا اور مضبوط علم حاصل کریں اور اس دنیا کے سامنے مضبوطی کے ساتھ خدا کے پیغام کو رکھیں۔ انہوں نے طلبہ کو اپنے علم میں گہرائی پیدا کرنے کا مشورہ بھی دیا اور وقت کے بہتر استعمال کی طرف توجہ دلائی۔ جناب مولانا مفتی امتیاز صاحب نے بھی طلبہ سے خطاب کیا، مولانا سہیل احمد ندوی نائب ناظم امارت شرعیہ و سکریٹری دارالعلوم الاسلامیہ نے مہمانان مکرم کے سامنے دارالعلوم الاسلامیہ میں تعلیم و تربیت کے نظام کا تعارف پیش کیا اور ایک سالہ سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔

پی ایم سی ایچ میں اساتذہ کی تقرری کو لیکر ہائی کورٹ کا سخت رویہ

پی ایم سی ایچ میں پوسٹ گریجویٹ کورس کے نظام کے لئے اساتذہ کی تقرری نہیں ہونے کے مدنظر پٹنہ ہائی کورٹ نے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے، ایم سی آئی بی پی ایس سی سے جواب طلب کیا ہے۔ جسٹس چکر دھاری شرن سنگھ کی سنگل بینچ نے ڈاکٹر مدھو کر اور دیگر کی جانب سے دائر رٹ پر سماعت کرتے ہوئے مذکورہ ہدایت دی ہے۔ واضح رہے کہ پی ایم سی ایچ میں پوسٹ گریجویٹ شعبہ میں 6 کورس بغیر ایم سی آئی کی اجازت کے چلائے جا رہے تھے، ماضی میں ہائی کورٹ کے سنگل بینچ نے اس سلسلے میں ایم سی آئی سے جواب طلب کیا تھا جس پر ایم سی آئی کے ذریعہ عدالت کو بتایا گیا تھا کہ یہاں مذکورہ کورس کے نظام کے لئے نہ تو اساتذہ ہیں اور نہ ہی بنیادی سہولتیں میسر ہیں۔ اس معاملے پر دوبارہ سماعت کرتے ہوئے عدالت نے بی پی ایس سی اور ایم سی آئی بتانے کی ہدایت دی ہے کہ پوسٹ گریجویٹ کورس کے نظام کے لئے اساتذہ کی تقرری کے سلسلے میں کئے جا رہے عمل کی تفصیلی معلومات عدالت میں پیش کریں۔ عدالت کا یہ بھی کہنا تھا کہ بغیر ایم سی آئی سے اجازت کے چلائے جا رہے کورس میں زیر تعلیم طلبا کا مستقبل اور وقت بھی برباد کیا جا رہا ہے، کیوں کہ جب تک ایم سی آئی سے مذکورہ کورس کی اجازت نہیں مل جاتی تب اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

میڈیکل اور پارامیڈیکل کے میدان میں خدمت خلق کے عظیم مواقع: نذر توحید مظاہری

مولانا منت اللہ رحمانی میموریل پارامیڈیکل انسٹی ٹیوٹ امارت شرعیہ کے ذریعہ چلایا جانے والا صوبہ بہار کا پارامیڈیکل کا ایک موقر و معتبر ادارہ ہے، بہار ہی نہیں بلکہ ملک کے طول و عرض میں یہ ادارہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہاں کے فارغین ملک اور بیرون ملک کے اہم اسپتالوں اور طبی اداروں میں اپنی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارہ میں فیزیوتھراپی اور پیتھالوجی میں ڈگری اور ڈپلوما کورس کرایا جاتا ہے۔ اور بہتر تعلیم و عمدہ تربیت کی وجہ سے طلبہ دوسرے اداروں کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی اس ادارہ کا طرہ امتیاز رہا ہے، اسی کے پیش نظر مختلف قسم کے پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ ملک کی مشہور و معروف علمی، دینی و روحانی شخصیات کا خطاب طلبہ کے درمیان وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے طلبہ کو اپنی عملی و دینی زندگی کو بہتر کرنے کی رہنمائی ملتی رہتی ہے، اسی سلسلہ میں مورخہ ۱۱/اکتوبر کو ملک کی مشہور و معروف علمی و روحانی شخصیت مولانا مفتی نذر توحید مظاہری مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ رشید العلوم چترا و قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ چترا رکن شوریٰ و عاملہ امارت شرعیہ کی قیادت میں ایک وفد نے مولانا منت اللہ رحمانی پارامیڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے مختلف شعبوں اور لیبوریٹریوں کا معائنہ کیا، طلبہ و اساتذہ سے ملاقات کر کے تعلیمی و تدریسی نظام کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ اس وفد میں مولانا منظور عالم قاسمی رکن شوریٰ و عاملہ امارت شرعیہ، مولانا محمد ابوالکلام شمسی آفس سکریٹری امارت شرعیہ، مولانا محمد عادل فریدی بھی شریک تھے۔ اس موقع پر حضرت مولانا مفتی نذر توحید مظاہری صاحب نے طلبہ و اساتذہ کے مجمع سے خطاب بھی کیا، اپنے خطاب میں انہوں نے طلبہ کو اپنی نیتوں کو درست کرنے اور خدمت خلق کے جذبے کو ہمیشہ ملحوظ رکھنے کی نصیحت کی، انہوں نے کہا کہ میڈیکل اور پارامیڈیکل کے لائن میں عزت بھی ہے، شہرت بھی ہے، دولت بھی اور خدمت خلق بھی ہے، اس لیے آپ ہمیشہ خدمت خلق کے جذبے سے کام کیجئے تو اللہ تعالیٰ عزت بھی دیگا اور شہرت و دولت بھی عطا کرے گا اور آخرت میں آپ کا عمل آپ کے لیے باعث نجات بھی بنے گا۔ اس پروگرام میں ایم ایم آر ایم کے سکریٹری جناب مولانا سہیل احمد ندوی بھی تھے، انہوں نے طلبہ و اساتذہ کے سامنے مہمانوں کا تعارف کرایا اور وفد کے سامنے پارامیڈیکل کے شعبہ سے متعلق حصولیابیوں کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ جناب ڈاکٹر سید نثار صاحب پرنسپل ایم ایم آر ایم نے وفد کو لیبوریٹریز کے تمام آلات وغیرہ کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی اور نظام تعلیم و تدریس کے بارے میں بتایا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر سید کمال وارث، جناب حسیب احمد صاحب، جناب فضیل احمد صاحب، جناب امتیاز صاحب کے علاوہ اساتذہ، کارکنان اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد شریک رہی۔ اخیر میں مفتی صاحب موصوف کی دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

جہیز کا شرعی حکم قرآن وحدیث کی روشنی میں

محمد ممشاد علی صدیقی فاسمی

اسلام میں شادی کا تصور محض دونوں کا ارتباط، فطری تقاضوں کی تکمیل اور حصول اولاد کا ہی نہیں بلکہ ایک عبادت کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ نکاح کر لیتا ہے تو آدھا دین مکمل کر لیتا ہے تو اسے باقی آدھے کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے''۔ (مشکوٰۃ ص ۲۶۸) عبادت وہی عند اللہ قابل قبول اور ماجور ہوتی ہے جو قرآنی اصول وآداب، ہدایات واحکامات کے اساسی بنیادوں پر مبنی ہو اور رسول اللہ ﷺ کی روشن تعلیمات کے مطابق ہو۔ قرآن کریم آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو رہتی دنیا تک نمونہ قرار دیا ہے: ''تم میں سے ہر ایک کے لئے رسول کا بہترین نمونہ موجود ہے''۔ (احزاب ۲۱) جو عمل بھی رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے خلاف ہوگا وہ ناقابل قبول اور گمراہی کا ذریعہ ہوگا۔ لڑکی والوں سے جہیز کے نام پر نقد یا ساز وسامان کا مطالبہ کرنا لڑکیوں پر سراسر ظلم اور شریعت کی کھلے عام خلاف ورزی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ شاہد ہیں کہ آپؐ نے نہ ہی اپنی ذات کے لئے اور نہ ہی اپنے کسی رشتہ دار اور زیر دست افراد کیلئے کبھی ایسا مطالبہ کیا اور نہ ہی کسی صحابیؓ سے اس قسم کی خرافات اور بدعات اور محرمات امور کا ارتکاب کرنا ثابت ہے۔

اسلامی معاشرہ کی بنیاد قرآن وسنت اور فقہ اسلامی پر ہے اس رسم بد کا تذکرہ نہ قرآن میں ہے اور نہ احادیث مبارکہ کے ذخائر میں اس کے ابواب ملتے ہیں اور نہ ہی فقہی کتابوں کے سمندر میں اس کے ذرات نظر آتے ہیں جن سے صاف پتا چلتا ہیکہ یہ حرام ونا جائز ہے، اسلئے کہ اگر یہ جائز ہوتا تو کہیں نہ کہیں ضرور اس کے اثرات ملتے چونکہ حیات انسانی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو اسلامی رہنمائی سے تشنہ ہو۔ معاشرتی نظام ہو یا عائلی مسائل ہر جگہ اس کے رہنمایانہ اصول موجود ہیں جو اسلام کے دین کامل ہونیکی ایک بین دلیل ہے۔ مشہور اندلسی عالم علامہ ابن حزم جہیز کے تعلق سے تحریر فرماتے ہیں: ''عورت کو جہیز دینے پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں، نہ ہی اس مہر کی رقم سے اور نہ اس کے دوسرے مال سے، پورا مہر اس کی ملکیت ہے۔ اس میں جو چاہے کرے''۔ (المحلی ج ۶/ ۶۸)

جہیز کا مطالبہ کرنا جائز نہیں اور اس غیر شرعی رسم کے خاتمہ کی متحدہ طور پر تحریک چلانا ضروری ہے ورنہ خدانخواستہ جس سرعت کے ساتھ یہ بدترین رسم شادی کا جز بنتی جارہی ہے یہ قوی امید ہے کہ آئندہ بغیر اس جہیز کے شادی کا تصور نا ممکن ہو اور زمانہ جاہلیت کی طرح لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے لگے یا پھر صحرائے وجود میں آنے سے قبل شکم مادر ہی میں اس کا خاتمہ کرنے لگے اور نوجوان لڑکیاں خودکشی کرنے پر مجبور ہو جائے جس کے لئے ایک اہم کام عورتوں کو وراثت میں حصہ دلانے کی متحدہ طور پر کوشش کرنی ہوگی اور لوگوں کے ذہن ودماغ میں یہ بات ڈالنی ہوگی کہ اسلام میں جہیز کا مطالبہ کسی بھی اعتبار سے جائز نہیں اور نہ ہی مرد کی غیرت وحمیت کے لئے زیب دیتا ہیکہ وہ جسے اللہ نے صنف نازک پر عقل وفہم، تدبر وتفکر اور طاقت وقوت کے اعتبار سے جو فوقیت اور افضلیت دی وہ ایک ادنیٰ مال کی بنا پر اپنی ذلت کا اظہار کرے۔ اسلئے شریعت اسلام نے نکاح کا اصل خرچ مہر، ولیمہ لڑکے والوں پر رکھا ہے اور لڑکی والوں پر شرعاً کوئی خرچ لازم نہیں ہے۔ انکی سب سے بڑی قربانی یہ ہیکہ ہوا پنی بیٹی دے رہے ہیں، اس کے باوجود ان پر مال اور ساز وسامان دینے کے لئے دباؤ ڈالنا انتہائی نامعقول بات ہے۔

شرعاً جہیز کی کوئی حقیقت نہیں:

قرآن مجید وکتب احادیث، صحاح ستہ وغیرہ میں جہیز کا ذکر ملنا تو درکنار بلکہ اسکے بعد صحابہ کرامؓ کے اقوال اور ائمہ اربعہؒ کی کتابوں اور فقہ کی امہات الکتب میں بھی باب الجہیز کے عنوان سے کہیں کوئی باب موجود نہیں اگر واقعتاً اس کا درجہ شرعاً جائز یا مباح کا ہوتا تو اس کا تذکرہ کہیں نہ کہیں ضرور ملتا جبکہ نکاح کے متعلق شرعی احکام مثلاً نان ونفقہ، مہر، طلاق اور عدت وغیرہ کے احکام کتابوں میں تفصیلاً ملتے ہیں حد تو یہ ہیکہ جس زبان میں قرآن وحدیث اور کتب فقہ کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور جس عربی زبان کی قرآن وحدیث میں تعریف کی گئی ہے اس قرآنی وآسمانی زبان میں بھی لفظ جہیز کا وجود نہیں ہے بلکہ عربی زبان کا لفظ جہاز سے امالہ کر کے جہیز بنالیا گیا۔ موجودہ دور میں جس سامان کو جہیز کہا جاتا ہے درحقیقت قدیم عربی لغت اور عہد نبویؐ وغیرہ میں اس کے لئے کوئی خاص لفظ ہی نہیں تھا اور نہ ہی اس کا رواج تھا، یہی وجہ ہیکہ جدید عربی لغت المنجد میں اس کے لئے بجائے لفظ جہیز کے البائنہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ صاحب المنجد۔ بین۔ مادہ کے تحت رقمطراز ہیں: البائنۃ، البائن کا مؤنث ہے۔ دلہن کا جہیز (مولدہ) مولدہ۔ لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ قدیم عربی زبان میں موجود نہیں تھا لیکن ضرورت کے تحت اسے وضع کیا گیا ہے جب یہ بات واضح ہوگئی کہ جہیز کا لفظ عربی زبان میں ہے ہی نہیں، تو پھر اسلامی اعتبار سے جہیز کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ وہ ایک غیر شرعی رسم ورواج ہوگا جس کا خاتمہ نکاح جیسی عبادت سے ضروری ہوگا۔ فقہ النسہ میں ہے: یہ ایک عرف ہو چلا ہیکہ بیوی اور اسکے گھر والے جہیز اور گھر کا سامان تیار کرتے ہیں اور عورت کو نئے گھر میں جانے کی مناسبت سے اس عورت کو خوش کرنے کا طریقہ ہے۔ (ج ۲، ص ۱۶۷) محض ایک رسم کی بنا پر شادی کو اتنا مشکل کر دیا گیا ہے کہ آج بچی کی شادی اتنی دشوار ہوگئی ہے۔

جہیز کے بارے میں ایک قابل ذکر بات:

اللہ تعالیٰ نے لڑکی کو ان کی صنفی خصوصیات کی بنا پر مطلوب بنایا ہے اور مرد کو ان کا طالب اسی بنا پر شریعت اسلام نے عورت کی عظمت ورفعت کا خیال رکھتے ہوئے مرد کو حکم دیا ہے کہ لڑکی کے اولیاء کو پیغام نکاح دینے میں خود اپنی جانب سے پہل کرے اور بوقت نکاح مہر کا انتظام کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی لڑکا تمہاری لڑکی سے نکاح کا پیغام دے جس کے اخلاق اور دین سے تم مطمئن ہو تو فوراً شادی کر دو۔ (ترمذی ج ۲، ص ۱۶۹) خیر القرون میں تقریباً اسی معیار پر شادیاں انجام پاتی تھیں کہ خود لڑکا یا لڑکے کا سرپرست لڑکی کے سرپرست سے نکاح کا خیال ظاہر کرتے تھے اور بہت آسان طریقہ سے سنت نکاح کی ادائیگی عمل میں آتی تھی نہ جہیز کی لعنت، نہ باراتیوں کا ہجوم اور نہ جوڑے اور گھوڑے کی غیر شرعی رسومات کا بندھن ہوتا تھا اور نکاح کے انتظامات کے اخراجات بھی لڑکے ہی برداشت کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے نوجوانوں! تم میں سے جب کوئی شادی کی ذمہ داری اٹھانے کی سکت رکھتا ہو اسے شادی کر لینی چاہئے کیونکہ وہ نگاہ کو پست رکھتی ہے اور شہوانی خواہشات کو بے لگام نہیں ہونے دیتی اور جو نکاح کی ذمہ داری نہ اٹھا سکتا ہو وہ روزہ رکھے اسلئے کہ وہ شہوت کو توڑنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ (بخاری ج ۲، ص ۷۵۸) اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مردوں کو حکم دیا ہے کہ استطاعت وقدرت کے بعد شادی کر لینی چاہئے ایسا نہیں کہ لڑکی والوں سے بھیک مانگ کر اپنی شادی رچائے۔ عقلی اعتبار سے بھی یہ جائز نہیں۔ مرد کو اللہ تعالیٰ نے طاقتور بنایا ہے، جسے زور وقوت کے ذریعہ کمانے کی بہترین صلاحیت عطاء کی ہے۔ قرآن کریم میں ہے: **الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علیٰ بعض وبما انفقوا من اموالھم** (النساء ۳۴) ''مرد عورتوں پر نگراں ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں''۔ اب لڑکے والوں کا لڑکی کے سرپرستوں سے کسی چیز کا مطالبہ کرنا شریعت کے منشاء اور مرد کی صفت قوامیت کے بالکل خلاف ہوگا۔ مشہور اندلسی عالم علامہ ابن حزم لکھتے ہیں: عورت کو اس بات پر مجبور کرنا جائز نہیں کہ وہ خاوند کے پاس سامان جہیز لائے نہ ہی اس مہر کی رقم سے جو شوہر نے اسے دی ہے اور نہ ہی اس کے دوسرے اپنے مال سے، مہر سارا اس کی ملکیت ہے اس میں جو چاہئے کرے شوہر کو اس میں کسی قسم کا دخل دینے کا حق نہیں۔ یہی قول امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ابی سلمان وغیرہ کا ہے۔ (المحلی ج ۶، ص ۸۶)

مروجہ جہیز کا مطالبہ حرام اور دینار شوت ہے:

اسلامی اعتبار سے جس طرح شادی کہ موقع پر لڑکی والوں سے رقم کا مطالبہ کرنا جائز وحرام ہے اسی طریقہ سے لڑکی یا اولیائے لڑکی سے جہیز پلنگ، بستر اور دیگر اشیاء کا مطالبہ کرنا بھی ناجائز ہے۔ بعض دفعہ لڑکے والے جہیز میں رقم، گاڑی اور گھریلو استعمال کی اشیاء کا باضابطہ طور پر لڑکی والوں سے مطالبہ کرتے ہیں اور عزت نفس کہ خاطر اسے ہبہ کا نام دے دیتے ہیں اور اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارا مطالبہ تو کچھ بھی نہیں تھا، لڑکی والے خود ہی ہبتاً دے رہے ہیں، تو یاد رہے کہ وہ ہبہ معتبر نہیں ہوگا اور فقہی اعتبار سے یہ ہبہ باطل ہوگا۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب: فتاویٰ قاضی خان میں ہے:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دی پھر دوبارہ اس عورت نے اسی شخص سے نکاح کرنا چاہا تو اس نے عورت سے یہ کہا کہ جب تک تم پہلے نکاح سے واجب ہونے والا مہر مجھے نہ دوگی میں نکاح نہ کرونگا۔ ابوالقاسم الصفارؒ نے فرمایا کہ ہبہ باطل ہو جائیگا، خواہ وہ وعدہ پورا کرے یا نہ کرے اسلئے کہ اس صورت میں عورت پر نکاح کا مالی عوض دینا لازم آتا ہے جبکہ شریعت نے عورت پر نکاح کا کوئی مال عوض عائد نہیں کیا۔ (فتاویٰ قاضی خان ج ۱، ص ۳۷۸) یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جب شوہر عورت سے نکاح کے بدلے مہر کے علاوہ کسی اور مال کا مطالبہ نہیں کر رہا ہو بلکہ اسی مہر کا مطالبہ کر رہا ہے جو اس نے پہلے دیا تھا وہ بھی جائز نہیں ہے اور وہ ہبہ بھی باطل ہے تو وہ مال جو آج کل علی الاعلان لڑکی والوں سے مطالبہ کر کے لیا جاتا ہے وہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ جبکہ شرعی اعتبار سے نکاح کے لئے عورت یا ان کے اولیاء پر کوئی مالی بدل عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا نکاح کے موقع پر مطالبہ سے ملنے والی رقم شرعاً رشوت ہوگی جس کا لینا دینا اور اس کے لئے واسطہ بننا سب حرام ہوگا اور از روئے حدیث ایسے سبھی لوگ مطعون ہوں گے۔ سنت مطہرہ میں شادی کے موقع پر رشتہ طے کرتے وقت یا شادی کے بعد لڑکی والوں پر کسی قسم کا خرچ اور بوجھ نہیں رکھا گیا بلکہ تمام اخراجات کا ذمہ دار لڑکے کو بنایا گیا ہے۔ اسی بناء پر اسے قوام کہا گیا ہے، پس لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے سرپرستوں سے کسی چیز کا مطالبہ کرنا شریعت کے منشاء کے خلاف ہوگا۔

مطالبہ کے بغیر جہیز دینے کا حکم:

شادی کے موقع پر لڑکے والوں سے مطالبہ کئے بغیر اگر لڑکی والوں کی جانب سے کچھ سامان دیا جائے تو شرعی طور پر اگر چہ وہ جائز ہوں گے اور اسکا لینا دینا دونوں درست ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ دی جانے والی چیز کا مقصد نام ونمود نہ ہو اور نہ ہی صاف الفاظ یا اشاروں کنایوں میں اس کا تذکرہ ہو۔ نبی کریم ﷺ کا حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو عقد نکاح کے وقت کچھ ضروری سامان دینا اسی قبیل سے تھا۔ اس کے علاوہ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہیکہ آپ ﷺ نے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے علاوہ دیگر صاحبزادیوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ دینے کا انتظام فرمایا تھ چنانچہ روایت میں ہے کہ جب غزوہ بدر کے موقع پر حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص بن ربیعہ جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے اور بدر کے قیدیوں کے ساتھ وہ بھی گرفتار ہو کر آئے تھے۔ ان کی رہائی کے لئے حضرت زینبؓ نے وہ ہار بھیجی تھی جو نکاح کے موقع پر ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے انہیں عطاء کیا تھا اسکی بنا پر نفس نکاح میں والدین کی طرف سے بیٹی کو سامان دینے کی تائید ضرور ہوتی ہے لیکن اسے جہیز نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے بیٹی کی رخصتی کے وقت کچھ تحائف دینے کی اباحت تو ثابت ہوتی ہے لیکن جہیز کے سنت ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شادی کے موقع پر بخوشی ایک دوسرے کو تحفہ دیا جا سکتا ہے اور اسلام میں تحفہ کا دینا صرف شادی ہی کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ بھی مستحسن ہے۔ حدیث میں ہے:۔ **تصافحوا یذھب الغل وتھادوا تحابوا تذھب الشحناء** (مشکوٰۃ ص ۴۰۳) اس کے باوجود بھی اگر ریا، نمود، یا پھر کسی اعتبار سے غیر اقوام سے شباہت لازم آتی ہو تو اس طرح کے ہدایا وتحائف سے اجتناب ہی بہتر ہوگا۔ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:۔ **فکم من مباح یصیر بالالتزام من غیر لفوم والتخصیص من غیر مخصص مکروھا**۔

کیا جہیز دینا سنت ہے؟:

حضرت زینبؓ کے واقعہ سے اس بات کا جواز ضرور ملتا ہے کہ نکاح کے پر مسرت موقع پر والدین اگر بطور تحفہ اپنی بیٹی کو کچھ دینا چاہیں تو کوئی حرج نہیں لیکن اس سے جہیز کے سنت ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ اس لئے کہ شادی کے موقع پر اس قسم کے تحائف کو عقلاً بھی جہیز قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی کسی نے محض ہار کو جہیز شمار کیا ہے اور نہ ہی فقہاء محدثین نے اس سے جہیز کے سنت ہونے پر استدلال کیا ہے ورنہ آج کل دلہا کو پہنایا جانے والا ہار بھی جہیز شمار ہوگا۔ (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

بقیات

بقیہ اللہ کی باتیں .. اور اگر عدل وانصاف سے فیصلے نہ ہوں گے تو دوسرے فریق کے اندر انتقام کا جذبہ ابھرے گا اور پھر اس کے بعد خونریزیاں ہوں گی اور حق وصداقت کے ساتھ فیصلے ہوں گے تو باہمی اعتماد واعتبار کی فضا قائم ہوگی اور تعلقات میں خوشگواری پیدا ہوگی اور آخری بات یہ ہے کہ جس قوم میں عہد وپیمان کا پاس ولحاظ نہیں ہوگا تو اس قوم پر اللہ تعالیٰ دشمن کو مسلط فرمادیں گے، اس حدیث میں جن پانچ روحانی امراض کا تذکرہ کیا گیا ہے، کیا ہمارا معاشرہ اس کے دلدل میں پھنسا ہوا نہیں ہے اور اس کی وجہ سے ہم ذلت ونکبت کے مہیب میں گرتے نہیں جارہے ہیں، ماضی میں ملکوں اور سلطنتوں کے درمیان جو فسادات برپا ہوئے اور خونریزیاں ہوئی، اگر اس کی حقیقت کا پتہ چلایا جائے تو اس کی تہہ میں جانے سے یہی معلوم ہوگا کہ انسانی معاشرہ انہیں برائیوں میں پھنسا ہوا تھا؛ اس لیے انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کو برقرار رکھنے اور امور معاشرت کو درست رکھنے کے لیے امانت کی حفاظت کریں، بے حیائی اور برائی سے بچیں، رزق حلال کے لیے جدوجہد کریں، اگر لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں اور عہد وپیمان کی پاسداری کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں، یقین مانیں کہ اگر ان چیزوں پر عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں خوشحالی اور کاروبار میں برکت عطا فرمائیں گے۔

بقیہ کتابوں کی دنیا...... مجموعی طور پر ''صد برگ'' کے سارے مشمولات باب چہارم کو چھوڑ کر تاریخ وتذکرہ ہی ہیں، تاریخ ماضی کا آئینہ اور تذکرہ انسانی زندگی کے لیے نشان راہ ہوتا، جن کو پڑھ کر جان کر ہمارے اندر اچھے بننے کا شوق، کچھ کر گذرنے کا جذبہ اور تاریخ کے نشیب وفراز سے عبرت حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ تاریخ، حوالوں سے آگے بڑھتی ہے اور اسی کے ذریعہ اس کا معیار واعتبار پرکھا اور جانچا جاتا ہے، تاریخی مضامین میں حوالوں کی کمی قارئین کو کھٹکے گی، یقیناً اخباری مضامین تاریخی حوالوں سے بوجھل نہیں کیے جاتے، لیکن اگر کتابی صورت میں آتے وقت اس کا اضافہ ہوجاتا تو قدر ومعیار کے اعتبار سے یہ کتاب حوالہ جاتی کتب میں داخل ہوسکتی تھی۔ سید مصباح الدین احمد کا اسلوب سادہ اور صاف ہے، وہ عربی اور فارسی آمیز اردو لکھنے سے پرہیز کرتے ہیں، تتابع اضافات اور لفظیات میں تنافر حروف اور غرابت الفاظ کا ان کے یہاں گذر نہیں ہے، ان کی تحریر میں تسلسل، روانی اور معلومات کی فراوانی جو مضمون شروع کرنے کے بعد قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور پورا مضمون پڑھوا کر ہی چھوڑتی ہے، ''صد برگ'' نام بھی ادبی اور پرکشش ہے، تحلیل لفظی اور مسمیٰ پر اس کے انطباق کی کوشش کروں تو بات بڑھ جائے گی۔

میں سید مصباح الدین احمد کو ان کی اولین تصنیف پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ ان کا قلمی سفر جاری رہے گا، وہ کم لکھنے اور معیاری لکھنے کے قائل ہیں یہ ایک اچھی سوچ ہے، لیکن کم لکھنے کا مطلب قلم بند کرکے رکھ دینا نہیں ہے، بڑھتی عمر کے ساتھ یہ صفت ان کے اندر دیکھی جارہی ہے جو ہم لوگوں کے لیے باعث تشویش ہے، مسلسل لکھتے رہنے کی گذارش اور کتاب کے قبول عام وتام کی دعا پر اس حرفِ چند کا اختتام کرتا ہوں۔ مارکیٹ میں آنے تک آپ بھی انتظار کیجئے۔

بقیہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام ... دینی مدارس میں مسلم آبادی کے زیادہ سے زیادہ چار (۴) فی صد بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کی جدید تعلیم کے لیے تو اتنی فکر اور کوشش کی گئی، لیکن جدید تعلیمی اداروں میں داخل چھیانوے (۶۹) فی صد بچوں کو بنیادی دینی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لیے اس کا عشر عشیر بھی کوششیں نہیں کی گئی۔ تعلیم کی دوئی ختم کرنے کے لیے ایک نظریہ یہ پیش کیا گیا کہ ابتدا میں ایک مرحلے تک بچوں کو دینی اور غیر دینی دونوں طرح کے مضامین پڑھائے جائیں۔ اس کے بعد اختصاص کی تعلیم شروع کی جائے۔ اس مرحلے میں بچے کے ذوق اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے کسی ایک فن کو خاص کردیا جائے اور وہ اس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور جس حد تک مہارت پیدا کرسکے، کرے۔ یہ ایک آئیڈیل نظریہ؟ تعلیم ہے، لیکن یہ جتنا دلکش معلوم ہوتا ہے اتنا ہی دشوار ہے۔ اس کے متعدد تجربے کیے جارہے ہیں، لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ہے۔ پھر بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس راہ میں برابر پیش قدمی کی جاتی رہے تو ان شاءاللہ منزل دور نہیں ہوگی۔

بقیہ سپریم کورٹ کے حالیہ چند فیصلے .... کنتھانم نے کہا کہ گوا کے چیف منسٹر کی حیثیت سے منوہر پاریکر نے کہا تھا کہ ان کی ریاست میں بیف کا استعمال ہوتا رہے گا کہ ان کی ریاست میں بیف کا استعمال ہوتا ہے، بالکل کسی بھی مقام پر غذائی عادات واطوار پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے، یہ عوام پر منحصر ہے کہ اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کریں، کنتھانم نے کہا کہ گوا جیسی بی جے پی کے زیر اقتدار ریاست میں بیف کھایا جاسکتا ہے تو کیرالہ میں بھی اس بات پر کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہئے، کیرالہ کے علاوہ دیگر آٹھ ریاستوں میں بیف کی اجازت ہے، سوال یہ ہے کہ اگر ان ریاستوں میں لوگ اپنی مرضی کے مطابق کھا پی سکتے ہیں تو دیگر صوبوں میں یہ بیجا پابندی کیوں ہے؟ عدالت کی نظر میں تو رازداری کا حق زندہ رہنے اور کھانے پینے کی مانند بنیادی حقوق میں سے ایک ہے، حکومت کو اسے سلب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

بقیہ جہیز کا شرعی حکم قرآن و حدیث کی روشنی میں ....
دوسری اہم بات یہ ہیکہ یہ فعل یعنی ہار کا دینا حضرت خدیجہؓ کا ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کا اور وہ بھی قبل بنوت کا ہے چنانچہ مؤرخ ابن ہشام اپنی کتاب ''سیرت ابن ہشام'' میں لکھتے ہیں:۔ کان ابو العاص من رجال مكة المعدودين مالا وامانة وتجارة. وكان خديجة خالنه فسألت خديجه رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم لايخالفها. وذالك قبل ان ينزل عليه الوحي فزوجه (سیرۃ ابن ہشام ج۱، ص۶۵۱) ترجمہ: ابو العاص، تجارت، امانت اور دولت میں مکہ کے ممتاز لوگوں میں سے تھے اور حضرت خدیجہؓ ان کی خالہ تھیں چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ ابو العاص سے زینب کی شادی کردیں اور رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہؓ کی رائے کے خلاف نہیں کرتے تھے اور یہ واقعہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ قابل غور بات یہ بھی ہے کہ بعض لوگ اپنی کم فہمی کی بنا پر حضرت زینبؓ اور حضرت فاطمہؓ کی شادی کو بنیاد بنا کر جہیز کے سنت ہونے پر استدلال کرتے ہیں جو بالکل نامعقول بات ہے۔ اس لئے کہ رسول ﷺ کی کل چار بیٹیاں تھی حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ ان میں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کی شادیوں کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے کتب احادیث وسیر میں جہیز دینے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا پس اگر جہیز دینا سنت رسولؐ ہوتا تو یہ کیسے مناسب ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے دو بیٹی کو تو جہیز دیا ہو اور دو کو محروم رکھا ہو، لہذا حضرت زینبؓ کے واقعہ سے جہیز کے سنت ہونے پر استقلال ممکن ہی نہیں۔

کیا حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو دیا جانے والا سامان جہیز تھا؟:

عموماً آج شادی کے موقع پر بعض حریص ومال کے لالچی افراد بڑے ہی شان سے اس بات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی لخت جگر حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنھا کو جہیز دیا تھا لہذا جہیز دینا نبی کی سنت ہے لیکن جو مختصر سامان رسول ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو دیا تھا اس کی حقیقت کیا تھی اس کی تہہ تک پہنچنے سے اس کی نگاہیں قاصر ہوتی ہیں اسلئے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو ضروری جہیز حضرت فاطمہؓ کو بوقت رخصتی دیا تھا اس کا تذکرہ احادیث کی کتابوں میں کچھ اس طرح ہے۔ امام نسائی نے اپنی سنن میں کتاب النکاح کے ضمن میں باب جهاز الرجل انبته آدمی کا اپنی بیٹی کو جہیز دینا کہ عنوان کے تحت حدیث ذکر کی ہے:۔

عن علي قال جهز رسول الله فاطمةؓ في خميل وقربة ووسادة حشوها ليف (نسائی ص ۷۷) حضرت علیؓ سے مروی ہیکہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی لخت جگر فاطمہ کو ایک سفید اونی چادر، ایک مشکیزہ اور ایک چمڑے کا تکیہ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی بطور جہیز دیا۔ مسند احمد میں حضرت علیؓ ہی سے کچھ اضافہ کے ساتھ مروی ہے:۔ ان رسول الله لما زوجه فاطمة بعث معه بخميلة ووسادة من ادم حشوها ليف ورحين وسقاء وجرّتين (مسند احمد ج۱، ص۱۰۶) ترجمہ: جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ کا نکاح ان سے کیا تو ایک چادر اور ایک اذخر گھاس بھرا ہوا تکیہ، ایک چکی اور دو مٹکے کے ساتھ روانہ کیا۔ ان روایتوں سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی لخت جگر کو جہیز میں یہ مختصر سامان دیا تھا لیکن حقیقت میں اسے جہیز نہیں کہا جاسکتا اسلئے کہ یہ سامان آپؐ نے سرپرست ہونے کی بنا پر بطور انتظام کہ عطاء کیا تھا اور حضرت علیؓ شروع ہی سے آپؐ کی کفالت میں تھے جس کی بنا پر ان کے لئے گھریلو ضروری سامان کا انتظام کرنا آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی۔

مشہور محدث ومؤرخ حافظ ابن عبد البرؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الاستیعاب میں لکھتے ہیں:۔ كان ابو طالب ذاعيال كثير. فاخذ رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم عليا فضمه اليه فلم يزل علي رضي الله عنه مع رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى زوجه من ابنته فاطمه (الاستیعاب ج۱، ص۳۸) ابو طالب کثیر العیال تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا تو وہ برابر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی رہے یہاں تک کہ بنت رسول حضرت فاطمہؓ سے ان کی شادی ہوگئی۔ ایک اور اہم وجہ حضرت فاطمہؓ کو رخصتی کے وقت دیے جانے والے سامان کے جہیز نہ ہونے کی یہ ہیکہ جو سامان رسول اللہ ﷺ نے انہیں عطا کیا تھا وہ خود حضرت علیؓ ہی کی طرف سے فراہم کردہ رقم سے خریدا گیا تھا۔ حدیث میں ہے: ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہیکہ حضرت فاطمہؓ سے عقد نکاح کے لئے ابو بکرؓ اور عمرؓ نے یکے بعد دیگرے پیغام بھیجا مگر رسول اللہ ﷺ نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ پھر ان دونوں حضرات نے حضرت علیؓ کو نکاح کی پیشکش کو کہا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا جب ان دونوں نے مجھے اس طرف متوجہ کیا تو میں فوراً چادر گھسیٹتا ہوا حضور ﷺ کے پاس حضرت فاطمہؓ سے نکاح کی درخواست لئے جا پہنچا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کچھ (مہر کے لئے) ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے پاس ایک گھوڑا اور ایک زرہ ہے۔ آپ ﷺ نے مجھ سے کہا کہ گھوڑے کی تمہیں ضرورت رہے گی البتہ زرہ بیچ دو تو میں نے وہ زرہ چار سو اسی (۴۸۰) درھم میں بیچ دیا اور اسے لاکر حضور ﷺ کی جھولی میں ڈالدیا۔ آپ ﷺ نے کچھ درہم حضرت بلالؓ کو دیکر فرمایا کہ اس سے خوشبو خرید لاؤ۔ پھر آپ ﷺ نے کچھ سامان تیار کرنے کا حکم دیا تو ایک چارپائی، ایک چمڑے کا تکیہ جس میں اذخر گھاس بھرا ہوا تھا۔ حضرت فاطمہؓ کے لئے تیار کیا گیا۔ (زرقانی شرح مواہب ج۲، ص۶) زرقانی کی دوسری روایت میں اس بات کی صراحت ہیکہ وہ زرہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھوں بیچی تھیء جسے پھر حضرت عثمان غنیؓ حضرت علیؓ کو واپس کردیا تھا۔ تو میں نے وہ زرہ حضرت عثمان کے ہاتھ چار سو اسی دراہم میں فروخت کردی پھر حضرت عثمانؓ نے وہ زرہ بھی حضرت علیؓ کو لوٹا دیا تو حضرت علی رقم کے ساتھ زرہ لیکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو بہت ساری دعائیں دیں۔ مذکورہ روایات سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہیکہ جو سامان رسولؐ نے حضرت فاطمہؓ کو بوقت رخصتی عطاء کیا تھا وہ حضرت علیؓ کی زرہ کی رقم ہی سے خریدا گیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے بحیثیت سرپرست انتظام فرمایا تھا جس سے بھی جہیز کا ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی جہیز کے سنت ہونے پر کوئی دلیل ملتی ہے۔

جہیز کی ذمہ داری شوہر پر ہے، نہ کہ عورت پر:

قرآن مجید قیامت تک آنے والی انسانیت کے لئے آخری کتابِ ہدایت ہے۔ رسول اللہ کا قول وعمل کتاب ہدایت کی عملی تفسیر ہے۔ ازدواجی ومعاشرتی زندگی کی پوری تفاصیل قرآن وسنت اور کتب فقہ میں موجود ہیں۔ مثلاً جائز وناجائز رشتے، نکاح، طلاق، خلع، ظہار، ایلا، حلالہ، مہر، ولیمہ، رضاعت، عدت، رجعت اور نان ونفقہ کے تمام مسائل واضح انداز میں موجود ہیں۔ لیکن ان تمام مسائل میں جہیز کا کہیں وجود نہیں ملتا اور نہ ہی قرون اولیٰ کی شادیوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہاں قرآن وحدیث کے دلائل اور عقل کے تقاضے سے یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جہیز یعنی دلہن کے رہنے سہنے کے لئے ضروری سامان کا مہیا کرنا یہ خود شوہر کی ذمہ داری ہے نہ کہ دلہن کی۔ قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے مرد کو قوام کی صفت سے عورتوں پر فضیلت دی ہے

''ان کو گھر دو رہنے کے واسطے جہاں تم آپ رہو، اپنے مقدور کے موافق اور انہیں تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ پہنچاؤ''۔ (الطلاق ۶) اس آیت میں مطلقہ خواتین کے سکنی ونفقہ کی ذمہ داری دوران عدت مرد پر عائد کی گئی ہے تو وہ عورت جس سے وہ شادی کرنا چاہ رہا ہے اس کے ضروری سامان کی ذمہ داری جسے عرف میں جہیز کہا جاتا ہے بدرجہ اولیٰ مرد پر ہوگی نہ کہ عورت یا اس کے والدین وسرپرست پر۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے بھی یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ نان ونفقہ اور رہنے سہنے کا انتظام کرنے کی ذمہ داری خاوند کی ہے۔

جلد نمبر 65/55 شمارہ نمبر 40 پرنٹر پبلیشر سہیل احمد ندوی نے جی ایم آفیسٹ پریس دریاپور پٹنہ 9934188997 میں چھپوا کر ہفتہ وار نقیب امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ ۸۰۱۵۰۵ سے شائع کیا۔

WEEK ENDING 16/10/2017
فون نمبر 2555351,2555014,2555668 فیکس 0612-2555280
E-mail: nazimimaratshariah@gmail.com

LEADING URDU JOURNAL OF IMARAT-E-SHARIAH
BIHAR ORISSA JHARKHAND

THE NAQUEEB WEEKLY
PHULWARI SHARIF,PATNA 801505

SSPOS PATNA Regd.No.PT 14-6-15-17
R.N.I.N.Delhi,Regd No-4136/61

میٹھی میٹھی بات تمہاری محفل محفل جانے ہے
لیکن تم بے درد ہو کیسے میرا ہی دل جانے ہے
(کلیم عاجز)

اسرائیل کی جارحیت

اسرائیل نے ایک بار پر مسجد اقصیٰ کے تعلق سے اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے جارحانہ اور ناپاک عزائم کی وجہ سے فلسطینیوں میں غم وغصہ کی لہر پیدا ہوگئی تھی اور بین الاقوامی سطح پر یہ مسئلہ ایک بار پھر توجہ کا حامل ہوگیا تھا۔

اسرائیل کی جانب سے مسجد اقصیٰ میں پابندیاں عائد کردی گئی تھیں، وہاں عام فلسطینیوں کا داخلہ عملا بند کردیا گیا تھا اور وہاں میٹل ڈیٹکٹرس کو نصب کرتے ہوئے فلسطینی عوام میں خوف ودہشت کی لہر دوڑانے کی کوشش کی گئی تھی، فلسطینی عوام کی جانب سے اسرائیل کے ان ناپاک منصوبوں کے خلاف زبردست احتجاج کیا گیا اور یہاں تشدد کی لہر شروع ہوگئی تھی۔

اسرائیل کی جانب سے وقفہ وقفہ سے یہاں ایسے اقدامات کئے جاتے ہیں، جن کے نتیجہ میں فلسطینی عوام میں برہمی کی لہر پیدا ہوتی ہے اور پھر پرتشدد واقعات پیش آتے ہیں، اسرائیل کے ان اقدامات کو ساری دنیا میں دیکھا گیا ہے اور فلسطینی عوام کے احتجاج اور اسرائیلی افواج کی ظالمانہ کارروائیوں کے نتیجہ میں ہونے والے جانی نقصانات بھی دنیا سے ڈھکے چھپے نہیں رہ گئے ہیں، سوشل میڈیا نے ان واقعات کو دنیا بھر میں پھیلانے میں اہم رول ادا کیا ہے، خود علاقہ کے ممالک کے عوام میں اس تعلق سے بے چینی پیدا ہونے لگی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان مسجد اقصیٰ سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور یہاں پیش آنے والے واقعات سے وہ خود کو لاتعلق نہیں رکھ سکتے، فلسطینی عوام اپنی جملہ بے بسی اور مسائل کے باوجود مسجد اقصیٰ کے لیے جدوجہد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے اور نہ ہی ان کے جذبات کو قابو میں کیا جاسکتا ہے، اسرائیل کے عزائم اور منصوبوں میں بھی یہی شامل ہے کہ فلسطینی عوام کو ہمیشہ نبرد آزما رکھا جائے؛ تاکہ اسے اپنے منصوبوں کی تکمیل کا موقع ملتا رہے، اسرائیل کی ان کارروائیوں پر بین الاقوامی سطح پر ناراضگی کی لہر پیدا ہوئی تھی۔

یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں بھی زیر بحث آیا تھا اور کئی ممالک کی جانب سے اسرائیل کی حرکتوں اور اس کی ظالمانہ کارروائیوں کی مذمت کی گئی ہے، اس کے باوجود اسرائیل کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آرہی ہے، اس سلسلہ میں اسرائیل کی تائید کرنے والے امریکہ کا دوہرا معیار ہے۔

امریکہ دنیا بھر میں انسانی حقوق کی اور انصاف کی دہائی دیتا نظر آرہا ہے؛ لیکن جہاں کہیں فلسطینی عوام کا مسئلہ درپیش آتا ہے، یا پھر اسرائیل کے مظالم کی بات ہوتی ہے وہ یا تو خاموشی اختیار کرلیتا ہے، یا پھر اسرائیلی جارحیت اور مظالم کی مدافعت کرنے کا جواز تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے، وہ ہر قیمت پر اسرائیل کی تائید وحمایت کرتا ہے اور اس تائید کے ذریعہ وہ بین الاقوامی انصاف کے اصولوں کی دھجیاں اڑایا جاتا ہے۔

عالم عرب اور عالم اسلام میں اسرائیل کی ان حرکات کے تعلق سے بے چینی اور غم وغصہ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، نہ صرف عوام کی سطح پر بلکہ اعلیٰ سطحوں پر بھی اب یہی صورتحال پیدا ہونے لگی ہے، سعودی عرب کے سابق فرمانروا شاہ فہد بن عبدالعزیز کے فرزند نے بھی اسرائیلی عزائم کے خلاف آواز بلند کی ہے اور انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے تحفظ کے لیے اب عالم اسلام ہی کو آگے آنے کی ضرورت ہوگی، دوسروں پر تکیہ اور انحصار کرنا درست یا کافی نہیں ہوگا۔

اسرائیل ہو یا امریکہ، اقوام متحدہ ہو یا پھر دوسرے بین الاقوامی ادارے، انہیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر صورتحال پر جلدی قابو نہیں کیا گیا اور اسرائیلی جارحیت اور اس کی ظالمانہ کارروائیوں پر روک نہیں لگائی گئی تو پھر صورتحال قابو سے باہر ہوسکتی ہے، مسلمان اپنے قبلہ اول کے تعلق سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتے، اس کے تقدس کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے اور نہ ہی اس کے تحفظ کو نظر انداز کرسکتے ہیں۔

عالمی سطح پر مسلمانوں میں اس تعلق سے جو بے چینی پیدا ہورہی ہے اور غم وغصہ پیدا ہورہا ہے، اس کو مزید شدت اختیار کرنے سے روکنا ان ممالک اور اداروں ہی کی ذمہ داری بنتی ہے، اب تک کی جو مثالیں موجود ہیں، ان کو دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ممالک اور ادارے اب تک اپنی ذمہ داری کی تکمیل میں ناکام ہوگئے ہیں، یا پھر انہوں نے اس تعلق سے عمدا مجرمانہ غفلت برتی ہے۔ اگر یہ ممالک اور ادارے مستقبل میں اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں لاتے اور اسرائیل کی تائید، یا اس کی جارحیت پر خاموشی کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں تو جو حالات پیدا ہوں گے، ان کی ذمہ داری ان ہی اداروں اور ممالک پر عائد ہوگی۔

جس وقت سے امریکہ میں ڈونالڈ ٹرمپ نے صدارت سنبھالی ہے، اس وقت سے اسرائیل کے عزائم میں اور بھی جارحیت اور شدت پسندی آگئی ہے، اس کے عزائم اور بھی خطرناک ہوگئے ہیں، خود ڈونالڈ ٹرمپ نے بھی کئی مرتبہ امریکہ کے روایتی موقف سے انحراف کرتے ہوئے اسرائیل کی جارحیت کی تائید وحمایت کا اشارہ دیا ہے، ان کا یہ موقف ظاہر کرتا ہے کہ وہ فلسطینیوں کو ان کے جائز حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کو مزید مستحکم کرنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کی جانب سے نئی آبادیاں بسائے جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ اس کے عوض بے گھر ہونے والے فلسطینیوں کو ہی نشانہ بنانے کے منصوبے ظاہر کئے گئے ہیں۔

یہ دوغلی پالیسی اور دوہرے معیارات ہیں اور ان کی وجہ سے حالات کو بہتر بنانے اور قابو میں کرنے کے بجائے حالات کو بگاڑنے میں زیادہ مدد ملتی ہے اور اس کے نتائج سے ہر کوئی واقف ہوسکتا ہے، یہ صورتحال کسی کے بھی حق میں بہتر نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

آج دنیا بھر میں جو حالات پیش آتے جارہے ہیں اور خاص طور پر مشرق وسطی میں جو صورتحال ہے وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ فلسطین۔اسرائیل تنازعہ کا کوئی مستقل اور دیرپا حل دریافت کیا جائے۔

فلسطینیوں کو ان کے جائز مقام اور حقوق سے محروم کرنے کا سلسلہ بند کرتے ہوئے ان کے ساتھ انصاف کیا جائے، انہیں اپنی سرزمینوں پر پوری عزت واحترام اور امن وسکون کے ساتھ زندگی گذارنے کے مواقع فراہم کئے جائیں، ان کا عرصہ حیات تنگ کرنے کی بجائے انہیں راحت بھری زندگی فراہم کرنے کے لیے اقدامات کئے جائیں، یہ سب کچھ ایسا ہے جس سے اسرائیل کبھی اتفاق نہیں کرسکتا اور نہ اس میں تعاون کرنے کے لیے وہ کبھی تیار ہوسکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسرائیل کو اس کے لیے مجبور کیا جائے، اس پر بین الاقوامی سطح پر دباؤ ڈالا جائے، جس طرح سے امریکہ یا اقوام متحدہ دیگر ممالک پر اپنے عزائم کی تکمیل میں رکاوٹ بننے پر تحدیدات عائد کرتے ہیں، اسی طرح کا رویہ اسرائیل کے ساتھ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

اس یہودی مملکت کو اس کی جارحیت اور ظالمانہ کارروائیوں سے روکنا ضروری ہے، یہ تنازعہ ضرورت سے زیادہ طوالت اختیار کرگیا ہے، چونکہ دنیا بھر میں کوئی بھی فلسطینیوں کے حقوق کے لیے حقیقی معنوں میں آواز بلند نہیں کررہا ہے؛ اس لیے اسرائیل کے عزائم اور حوصلے بلند ہوتے جارہے ہیں، وہ اپنی جارحیت پسندی میں مزید شدت پیدا کرتا جارہا ہے، وہ امریکہ کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد دوسرے ممالک کو بھی خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کررہا ہے۔

اقوام متحدہ جیسے ادارہ کی اسرائیل کو کوئی پرواہ نہیں ہے اور وہ یہاں منظور ہونے والی قراردادوں کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں ہے، اس کے باوجود اقوام متحدہ، یا امریکہ اسرائیل کے خلاف کسی طرح کی کارروائی پر غور تک کرنے کو تیار نہیں ہیں، ان کا یہی طریقہ کار اسرائیل کے حوصلے بلند کرنے کا باعث بن رہا ہے، تاہم اب اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہئے، ظلم جب اپنی انتہا کو پہونچتا ہے تو اس کو ختم کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو تو کمر کسنی پڑے گی۔

عرب ممالک ہوں یا دنیا بھر کے دوسرے تمام مسلم ممالک، ان سب کو ایک آواز ہوکر اسرائیلی جارحیت کے خلاف اور فلسطینی عوام کے حقوق کے آواز بلند کرنے کی ضرورت ہے، جب تک عالم اسلام سے ایک مستحکم آواز بلند نہیں ہوتی، اس وقت تک نہ اسرائیل کو اور نہ اس کے حواریوں کو روکنے میں کامیابی مل سکتی ہے، اسرائیل سے تعلقات کی قیمت پر فلسطینی عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم اور مسجد اقصیٰ کے تقدس کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

عالم اسلام کو ایک آواز میں ہوکر بات کرنا چاہئے اور وہ ایسا کرپائیں تو پھر کوئی عجب نہیں کہ امریکہ یا اسرائیل کے دوسرے حواریوں پر بھی دباؤ بنایا جاسکے کہ وہ اپنے ظلم کا سلسلہ روکے، اگر ایک بار پھر اس تعلق سے محض رسمی بیان بازی کرکے خاموشی اختیار کرلی جاتی ہے تو پھر اسرائیلی مظالم کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگا، جس کی ذمہ داری عالم اسلام پر بھی عائد ہوگی۔ (مولانا محمد ہاشم قاسمی، حیدرآباد)